انوکھا سفر

بلقیس ریاض

انوکھا سفر

سفرنامہ



اردو کتب خانہ

URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

بلقیس ریاض

باب اول

برازیل کا سفر

بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے میرے میاں صاحب تیار تھے۔ نہ جانے ان کے دل میں کیا آیا کہ پاسپورٹ پر میرا ویزہ بھی لگوا دیا تھا۔ برازیل کے خوبصورت شہر میں یہ کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے پتہ چلا کہ میاں صاحب اکیلے نہیں بلکہ میں بھی ان کے ساتھ جا رہی ہوں تو مجھے ہمیشہ کی طرح حیرت ہوئی کہ زندگی میں جتنے بھی سفر ہوئے ہیں وہ اچانک ہی ہوئے ہیں۔

ریوڈی جنیرو جو کہ جنوبی امریکہ میں واقع ہے' امریکہ میں نہ جانے کتنی مرتبہ جا چکی ہوں مگر جنوبی امریکہ میں جانے کا پہلا اتفاق تھا۔ سیاحت کا شوق ہمیشہ سے ہی ہے اور میں نے چپ چاپ جانے کی حامی بھر دی اور اس طرح ایک دن میں ہی میں جنوبی امریکہ جا رہی تھی۔ لاہور سے کراچی اور کراچی سے ایمسٹرڈیم اور راستے میں فرینکفرٹ تقریباً آٹھ گھنٹے رکنا تھا اور پھر دوسرا جہاز بدل کر فرینکفرٹ سے ریوڈی جنیرو جانا تھا۔ اتنا لمبا سفر سن کر نفسیاتی طور پر تھکن محسوس ہونے لگتی تھی۔

پی آئی اے کے ذریعے کراچی رات گیارہ بجے پہنچے اور صبح آٹھ بجے لفتیزہ ائیر لائن سے ریوڈی جنیرو کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ لف تیزہ کی فلائیٹ ہر لحاظ سے بڑی آرام دہ فلائیٹ تھی۔ اکا دکا پاکستانی مسافر دکھائی دے رہے تھے۔ ورنہ چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں تو تمام باہر کے ملکی باشندے نظر آ رہے تھے۔ جہاز میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ حالانکہ خلاف توقع جہاز مسافروں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ شاید ہی کوئی سیٹ خالی ہو میری سامنے کی سیٹ پر نہایت ہی موٹی میم اور اس کا صاحب بیٹھا تھا۔ دائیں اور بائیں جانب بھی غیر ملکی لوگ بیٹھے تھے۔ اگر کھانستے بھی تو رک رک کر کھانستے تاکہ دوسرے لوگ ڈسٹرب نہ ہوں۔

سفید بلاؤز اور کالی سکرٹ میں ملبوس ائیر ہوسٹس لبوں میں مسکراہٹ سجائے بڑی پھرتی سے مشروبات پلانے میں مصروف تھیں۔ ہر طرح کی ڈرنک سرو ہو رہی تھی۔ کوک' جوسز' شیمپئن' وائن' وِسکی اور نہ جانے کتنی قسم کی شراب جو کہ غیر ملکی بڑی رغبت سے پی رہے تھے۔ یہ نہیں کہ مفت مل رہی تھی تو پیتے ہی چلے جا رہے تھے' ان کے پینے میں بھی ایک خاص انداز اور ٹھہراؤ تھا اور کمال تو ائیر ہوسٹس کا

تھا جو ہر مسافر کے بلانے پر بڑی خوشدلی کے ساتھ ان کی بات سنتیں اور ان کی حاجت کے مطابق ہر طرح کے مشروب ان کو مہیا کرتی تھیں۔

کھانا ہی زندگی ہے

سفر بڑے پرسکون طریقے سے کٹ رہا تھا مگر ایک بات کا بار بار افسوس ہو رہا تھا کہ سامنے کی سیٹوں میں جو نوجوان موٹی میم بیٹھی تھی وہ اس قدر موٹی تھی کہ کرسی میں پھنس کر بیٹھتی اور تھوڑے سے وقفے میں اٹھ کر کھڑی ہو جاتی۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آ رہا تھا اور جی کرتا تھا کہ کوئی جادو کی چھڑی ہو تو اس کے جسم پر لگاؤں تاکہ چھڑی لگتے ہی وہ پتلی ہو جائے اور کرسی پر آرام سے بیٹھ سکے۔ مگر میرے پاس اس وقت جادو کی چھڑی نہیں تھی کہ اس کو پتلا کرتی مگر ایک کام ہو سکتا تھا کہ اس کے پاس بیٹھا ہوا مسافر اٹھ جاتا اور وہ سیٹ کا بازو اٹھا کر کھلی ہو کر بیٹھ جاتی۔ مگر ساتھ کا مسافر شاید اس کا شوہر دکھائی دے رہا تھا' وہ اٹھ کر بیچارہ جاتا بھی تو کہاں جاتا۔ نیچے سمندر اور اوپر کھلا آسمان۔ اسی کشمکش میں دوبئی آ گیا تھا۔ تمام مسافروں کو ائیر پورٹ پر اترنے کی اجازت مل چکی تھی۔ جہاز سے نکل کر جونہی باہر آئے تو نیلے رنگ سے بورڈنگ کارڈ ہاتھ میں ہر مسافر کو تھما رہے تھے تاکہ واپس جہاز میں بیٹھنے کے لیے وہ بورڈنگ کارڈ دکھائے جائیں۔

ڈیوٹی فری شاپ کی جانب مسافر چل پڑے۔ ہم لوگ بھی اسی راستے پر نکل پڑے۔ ڈیوٹی فری شاپ پر ہر طرح کے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ زیادہ تر پاکستانی بھی تھے۔ سونے کی جیولری کے سٹال ڈیوٹی فری شاپ کے چوراہے پر سجے ہوئے تھے۔ عربی لوگ ان کے کاؤنٹروں پر کھڑے گاہکوں کو جواہرات دکھا رہے تھے۔ کافی خواتین وہاں پر خریداری کر رہی تھیں۔

ایک سٹال پر کھڑے ہو کر میں نے زیورات کے شوکیسوں پر نگاہ دوڑائی تو شاید ہاتھ کی بنی ہوئی جیولری تھی' اس کے علاوہ ادھر ادھر کافی دکانیں تھیں جن میں ہر طرح کی شراب' بسکٹ' سگریٹ اور چاکلیٹ وغیرہ تھیں۔ کہیں کہیں کپڑوں کی دکانیں بھی تھیں۔ لوگ جو کہ واپس پاکستان جا رہے تھے اور شاید وہ پی آئی اے سے سفر کرتے ہوئے کراچی جا رہے تھے' خاص کر وہ دھڑا دھڑ پرفیوم اور چاکلیٹ کی خریداری میں مصروف تھے۔ چلتے چلتے اس موٹی میم سے بھی مڈبھیڑ ہو گئی تھی وہ بھی چاکلیٹ کی دکان پر سامان کی خریداری کر رہی تھی۔ ڈھیر ساری چاکلیٹیں اس نے خرید رکھی تھیں اور دھڑا دھڑ چاکلیٹیں کھا رہی تھی' مجھے دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ بے چاری اتنی موٹی ہے کہ جہاز کی سیٹ میں فٹ نہیں ہوتی اور اوپر سے چاکلیٹیں کھا رہی ہے۔ اس بندی خدا کو چاہیے تھا کہ کچھ ڈائٹنگ کرتی تاکہ اس قابل ہو جاتی کہ جہاز کی سیٹ' بس کی سیٹ' سینما کی سیٹ میں فلم دیکھتے ہوئے کم از کم کوئی تنگی محسوس نہ کرے مگر وہ تو ہر طرح

سے بے نیاز تھی اور رہ رہ کر مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ نیوی بلیو سکرٹ اور سرخ بلاؤز پہنے ہوئے تھی' گورا چٹا رنگ' گہری سرخ لپ اسٹک میں کچھ اور بھی نکھر آیا تھا۔ وہ میرے قریب سے گزری تو میں نے پوچھ ہی لیا۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''میں فرینکفرٹ جا رہی ہوں۔''

''خدایا تیرا شکر'' میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بے چاری کو ریو تک جانا نہیں پڑا ورنہ وہاں تک جاتے ہوئے تو اس نے لہولہان ہو جانا تھا۔

''آپ فرینکفرٹ میں رہتی ہیں؟''

''جی' میں فرینکفرٹ میں رہتی ہوں' آج کل ہولیڈے پر پاکستان آئی ہوئی تھی۔ یہ میرے منگیتر ہیں جو پاکستان میں سروس کرتے ہیں۔'' اس کے قریب ہی درمیانے جسم کے بندے نے جھٹ سے ''ہیلو'' کہا تو جواباً مجھے بھی ہیلو کہنا پڑا۔

''تو کیا یہ اس کا شوہر نہیں بلکہ منگیتر ہے۔'' ابھی میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ وہ مسکرائی۔

''میری منگنی کو پانچ سال ہو چکے ہیں۔ جب اس کی پاکستان سے تبدیلی ہو گی اور واپس فرینکفرٹ آئے گا تو پھر شادی کروں گی۔''

''کیوں' پاکستان پسند نہیں ہے کیا؟''

''خوبصورت ہے مگر۔۔۔۔۔۔۔''

''مگر اچھا نہیں لگا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو لگا ہے مگر وہاں کے لوگ ہنستے ہیں' جب بھی میں ان کے قریب سے گزرتی ہوں۔''

''ہنسنا تو ہوا' تم ذرا اپنا خیال ہی رکھو۔'' میں نے پھر سوچا۔

''آپ کیا پیدائشی فربہ ہیں؟''

''خیر پیدائشی تو نہیں مگر مجھے ہر وقت کھاتے رہنا بہت پسند ہے۔ اور ہمارے ملک میں کوئی شخص کیا ہی کیوں نہ ہو مگر دنیا اس پر ہنستی نہیں ہے۔ پاکستان کے لوگ عجیب سے ہیں۔''

''اچھا۔۔۔۔۔۔۔لیکن میں تو نہیں ہنستی' میں بھی تو پاکستانی ہوں۔''

وہ مسکرائی۔

''آپ دل ہی دل میں ضرور میرے بارے میں سوچتی ہوں گی۔''

میں تو اس لڑکی کی بات پر حیران ہو گئی تھی' اس نے میرے دل کا حال ایسے جان لیا جیسے کہ اسے الہام ہو گیا ہو۔

وہ گویا ہوئی۔

''میں ایک سائیکرسٹ اور فرینکفرٹ میں خاص کر نوجوان طبقے کا علاج کرتی ہوں۔ میری ایک ہی کمزوری ہے وہ ہے کھانا۔ دنیا میں بار بار تھوڑی آنا ہے۔ جو بچے اور جوان زمانے سے ستائے ہوئے میرے پاس آتے ہیں تو میں یہی کہتی ہوں بھول جاؤ سارے غم اور خوب کھاؤ پیو تا کہ تم لوگوں کی صحت بن جاؤ اور سارے غم بھول سکو۔''

''تو کیا نوجوان طبقہ آپ کی باتوں پر عمل کرتا ہے؟''

''کئی لڑکیاں تو عمل کرتی ہیں اور خوب موٹی ہو جاتی ہیں۔ مگر کونشیس ہو کر بیوٹی پارلروں کی طرف بھاگتی ہیں۔ دراصل میں ان کی توجہ دوسری طرف مبذول کر دیتی ہوں۔ وہ اپنا غم بھول بھال کے بیوٹی پارلروں کے چکر کاٹنے لگ جاتی ہیں۔''

''آپ بیوٹی پارلر کیوں نہیں جوائن کرتیں؟''

''مجھے اپنے کام سے ایک لمحے کے لیے فرصت نہیں ہے اور اگر فرصت ملے بھی تو میں فگر مینٹین نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے کھانے کا بہت شوق ہے اور اچھا کھانا خدا کی نعمت ہے' ہر انسان کو تھوڑی ملتا ہے۔''

اس نے ٹوبلر چاکلیٹ کا دوسرا پیکٹ کھولا اور مزے لے لے کر اسے بھی کھانے لگی تھی۔ میں ان کے ساتھ باتوں میں مشغول تھی اور میرے میاں سامنے کی دکان میں گھسے ہوئے ونڈو شاپنگ کر رہے تھے۔ اچھا موقعہ تھا اور میں اپنا وقت پاس کر رہی تھی کہ چلو اس کے دل کی بات پتہ تو چلی کہ یہ خاتون اتنی موٹی کیوں ہے۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''جنوبی امریکہ۔''

''آپ کیا وہاں گئی ہیں؟''

''نہیں' زندگی رہی تو ضرور جاؤں گی۔''

اس کا منگیتر ہمارے درمیان چپ چاپ کھڑا تھا۔ پانچ سال سے وہ اسے پرکھ رہی تھی مگر ان میں ابھی تک انڈراسٹینڈنگ نہیں

ہو سکی تھی۔

''آپ شادی کروا کر پاکستان چلی جائیں۔''

''نہیں' یہ جب بھی فرینکفرٹ آیا تو شادی تبھی کروں گی۔''

''چاہے انہیں واپس آتے آتے پانچ سال اور لگ جائیں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''خیر پانچ سال نہیں لگیں گے' ایک یا دو سال اور لگ جائیں گے۔ ویسے بھی ہمیں پاکستان میں بہت گرمی لگتی ہے۔ کراچی میں خاص کر اتنا حبس ہے کہ میرا وہاں پر دم گھٹتا ہے۔ اگر لاہور ان کی ٹرانسفر ہوتی تو وہاں پر اس قدر گرمی پڑتی ہے کہ بندے کا حشر نکل جاتا ہے۔''

''آپ لاہور بھی گئی تھیں؟''

''جی' چند روز یہ کمپنی کی طرف سے لاہور بھی گئے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ گئی تھی۔ پرانا شہر ہے' اچھا تو تھا مگر ہم لوگ وہاں نہیں رہ سکتے۔''

میں نے سوچا۔۔۔۔۔۔ کہتی تو ٹھیک ہے ایک نارمل بندہ وہاں کی گرمی برداشت نہیں کر سکتا تو یہ بے چاری سیروں کے حساب سے چربی اپنے جسم میں سمیٹے ہوئے ہے' اس کا تو وہاں پر برا ہی حال ہونا ہے۔

میں ان کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی کہ میرے میاں مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ گئے تھے۔ ان کی بھی علیک سلیک کروائی۔ ابھی ہم لوگ وہاں کھڑے ہی تھے کہ اناؤنسمنٹ ہونے لگی کہ جہاز میں بیٹھا جائے۔ ہم نیلا کارڈ ہاتھ میں تھامے ہوئے متصل ٹرمینل کی جانب چل پڑے تھے۔

سفر ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا' جہاز ایمسٹرڈیم کی طرف رواں دواں تھا۔ سامنے سکرین کی طرف دھیان گیا تو کوئی فلم چل رہی تھی' جسے ہیڈ فون کے ذریعے دیکھا جا رہا تھا۔ کسی قسم کی بے چینی اور ہلچل نہیں تھی۔ مسافر حسب معمول بت بنے فلم دیکھنے میں مصروف تھے۔ کئی مسافر ایسے بھی تھے جو مطالعہ میں غرق تھے۔ میری برابر کی سیٹ پر تو کچھ میٹھی نیند سوئے ہوئے تھے۔ ائیر ہوسٹس ٹرالی گھسیٹتے مسافروں کو کھانا پیش کر رہی تھی۔

مسافروں کی کھلتی اور بند ہوتی آنکھیں ایک دم کھل گئی تھیں اور خاموشی سے وہ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ کھانے کے بعد جب چائے پیش کی گئی تو ایسا لگنے لگا جیسے نیم گرم شربت پی رہے ہوں۔ ''شاید اسی قسم کی چائے کے شوقین ہیں یہ لوگ۔'' میں نے سوچا۔

چائے دوبارہ سے منگوائی تو وہ بھی اسی قسم کی تھی جس کو پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

میرے میاں کو سگریٹ پینے کی طلب ہوئی تو وہ پچھلی سیٹوں پر چلے گئے تھے۔ میری ایک فرینکفرٹ کی رہنے والی خاتون سے بات چیت شروع ہو گئی تھی جو اپنی بڑی بہن اس کے بیٹے اور اپنے والدین کے ہمراہ میرے قریب بیٹھی ہوئے تھی۔ نوجوان لڑکا جو اس کی بہن کا بیٹا تھا میں سمجھے ہوئے تھی کہ اس کا بیٹا ہے۔ ادھیڑ عمر کی خاتون ابھی تک غیر شادی شدہ تھی۔ اور اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مستقبل میں بھی شادی کرنے کی خواہاں نہیں ہے۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آخر آپ مستقبل میں بھی شادی کی خواہشمند نہیں ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟"

وہ زیر لب مسکرائی اور جواب دیتے ہوئے بتانے لگی۔

"گو کہ ہم فرینکفرٹ میں رہتے ہیں مگر ہمیں کام کے سلسلے میں برازیل رہنا پڑ رہا ہے وہاں پر اس قدر غربت ہے کہ ہم لوگوں کو کسی قسم کا تحفظ نہیں ہے۔ آدمی جب چاہے شادی کر کے بھاگ سکتا ہے اور اور بیوی کو ہی اپنے بچے پالنے پڑتے ہیں۔ یہ لڑکا جو آپ دیکھ رہی ہیں یہ میری بہن کا بیٹا ہے۔ میری بہن نے اپنی پسند کی شادی کی تھی مگر اس کا شوہر شادی کے دو سال کے بعد ہی بھاگ گیا تھا اور میری بہن اپنے والدین کے گھر چلی گئی تھی اور اس لڑکے نے وہاں پر ہی پرورش پائی ہے۔ اب یہ جوان ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ شادی ہی نہیں کروں گی' آزاد رہوں گی۔ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا مزہ ہی اور ہوتا ہے۔ کسی قسم کی محتاجی نہیں ہوتی ہے۔ ہم سب کام کرتے ہیں اور گزارہ آسانی سے ہو جاتا ہے۔ میرے والدین بوڑھے ہو چکے ہیں مگر وہ بھی ملازمت کر رہے ہیں۔"

اس خاتون کے کہنے پر میں نے اچٹتی سی نظر والدین پر ڈالی تو ان کے جھریوں سے بھرے چہرے اس بات کی غمازی کرتے تھے کہ وہ بے انتہا بوڑھے ہو چکے ہیں مگر ان کے چہروں پر سکون اور اطمینان کی لہر تھی۔ کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ ایک وقار اور تمکنت سے بیٹھے تھے۔ جوان لڑکا ان کے بیچ میں بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی ادھیڑ عمر کی ماں اس کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے باتیں کر رہی تھی۔ یہ دوبئی میں کسی کام کے سلسلے میں گیا تھا اور واپسی پر ریوڈی جنیرو جا رہا تھا۔ اتنا لمبا سفر تھا کہ ابھی سے مجھے تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں اتنی تھک گئی ہوں تو ان بوڑھوں کا نہ جانے کیا حال ہو گا۔ مجھ سے نہ رہا گیا تو پوچھ لیا۔

"آپ کے والدین تو تھک جائیں گے۔۔۔۔۔۔۔ سفر کافی لمبا ہے۔"

"میرے والدین اس قسم کا سفر کر کے بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ وہ اس عمر میں بھی سیر کرنے کے بڑے شوقین ہیں۔ کمپنی کی طرف

سے دوبئی جانے کے لیے جب کہا گیا تو بخوشی یہ لوگ راضی ہو گئے تھے۔ سال میں ایک یا دو مرتبہ ایسا موقعہ ملتا ہے' سیر بھی ہو جاتی ہے اور کام بھی نمٹا لیتے ہیں۔''

اس کی باتوں سے میں اندازہ لگا رہی تھی کہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی وہ لوگ ضائع نہیں کرتے۔ دنیا کو گھوم پھر کے قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

فلم مسلسل چل رہی تھی۔ لڑکے کو نیند آ رہی تھی۔ اس نے اپنی ماں کے کندھوں پر سر رکھ دیا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ سچ ہے کہ ماں کے لیے اولاد چاہے جتنی بھی بڑی ہو جائے مگر وہ ماں کی نظر میں بچہ ہی ہوتی ہے۔ وہ بچے کو کندھے سے لگائے فلم دیکھ رہی تھی مگر دوسری بہن جو میرے قریب ہی بیٹھی تھی' وہ مجھ سے باتوں میں مشغول تھی۔ اچانک سامنے نظر پڑی تو موٹی لڑکی ایک بار پھر کھڑی ہو چکی تھی۔ اور نہ جانے اس کے جی میں کیا آیا کہ وہ کاؤنٹر کی طرف چلی گئی تھی۔ اور چند لمحے ہی نہیں گزرے تھے کہ کوک کا ٹین اور پی نٹ ہاتھ میں پکڑے ہوئے دوبارہ اپنی سیٹ کی طرف آ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے سیٹ کے اندر فٹ ہو کر اس نے کمال پھرتی کے ساتھ ٹن کو کھولا اور پی نٹ کے ساتھ مزے مزے سے کوک پینے لگی تھی۔ اس کا ہم سفر ساتھی جو اس کا منگیتر بھی تھا آنکھیں بند کئے سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ بے چاری سیٹ میں پھنسنے کی وجہ سے ٹھیک طرح سے بیٹھ نہیں سکتی تھی تو کوکا کولا پینے میں ہی مصروف ہو گئی تھی۔ اب تو اس کا سفر کافی کٹ چکا تھا۔ ایمسٹرڈیم آنے والا تھا۔ ایئرپورٹ پر اس نے گھومنا پھرنا تھا اور ہو سکتا ہے چاکلیٹس کھانے کی بجائے کچھ اور چیزوں کو کھانا پسند کرتا تھا۔ مگر یہ تو خدا ہی جانتا تھا کہ اب ایمسٹرڈیم اتر کر کیا کھانے والی تھی۔ ابھی تو جہاز میں پڑے راشن پر اکتفا کر رہی تھی۔

کچھ دیر ایمسٹرڈیم میں

ایمسٹرڈیم آ گیا تھا اور مسافروں نے اترنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح نیلے رنگ کے کارڈ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈیوٹی فری شاپ کی جانب چل پڑے تھے۔ گو کہ تھکن سے برا حال تھا مگر جہاز میں بیٹھے رہنے سے اور بھی تھکن کا احساس ہونا تھا' اس لیے اترنے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔ ایمسٹرڈیم کا ایئرپورٹ صاف ستھرا تھا۔ فرش اتنے صاف کہ پاؤں رکھتے ہوئے یوں ڈر لگتا تھا کہیں پھسل ہی نہ جائیں۔ سرخ بلاؤز اور نیلا سکرٹ آگے کے مسافروں میں سے دور سے دکھائی دے رہا تھا' شاید اس خاتون کو زور کی بھوک لگ رہی تھی وہ تیزی کے ساتھ اپنے منگیتر کا ہاتھ تھامے ہوئے قدم بڑھا رہی تھی۔ صرف ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ فرینکفرٹ

آتے ہی اس کی مشکل آسان ہونے والی تھی۔

تمام ملکوں کے ڈیوٹی فری شاپ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ ہر طرح کی چیزیں ایئر پورٹ پر دستیاب ہوتی ہیں۔ کہنے کو ڈیوٹی فری شاپ ہوتی ہیں مگر بازاروں کی نسبت چیزیں نہایت ہی مہنگی ہوتی ہیں۔ صرف گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرانے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہوتا ہے کہ "ڈیوٹی فری ہے" مگر کوئی ان لوگوں کی چالوں کو کیا جانے۔ ڈیوٹی فری شاپ کے سنیک بار میں وہ میم واقعی ہی کھڑی تھی۔ کافی کا پیالہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاؤنٹر کے پاس کھڑی تھی اور ایک کنگ سائز کا برگر اس کے ہاتھ میں تھا۔ مگر اس کا منگیتر صرف خالی کافی ہی پی رہا تھا یا شاید اس کے لیے فکر کر رہا تھا کہ اگر وہ برگر کھا لے تو کہیں کرنسی ہی کم نہ پڑ جائے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ خالی کافی پی رہا تھا یا اس کی طرح پیٹو نہیں تھا۔ اس سنیک بار کو کراس کر کے ہم دوسری طرف دکانوں کے قریب ونڈو شاپنگ کرنے لگے تھے۔ یہاں پر بھی جیولری کی دکانیں' کاسمیٹکس کی دکانیں' شراب' سگریٹ' ملبوسات' جوتے یعنی ہر طرح کی دکانیں نظر آ رہی تھیں۔ ونڈو شاپنگ کرنا اچھا بھی لگتا ہے ایک تو سیر ہو جاتی ہے اور دوسرا دل بھی لگا رہتا ہے۔ پونا گھنٹہ گھومنے پھرنے سے کافی تھکن جاتی رہی تھی۔

ایک بار پھر جہاز میں بیٹھ چکے تھے۔ فرینکفرٹ کا راستہ جلد ہی کٹ گیا تھا۔ فرینکفرٹ آنے کی مجھے بھی خوشی تھی کہ چلو اس بے چاری غریب عورت کی خلاصی ہوئی۔ گھر جا کر کھلے سے پلنگ پر ڈھیر ہو جائے گی یا شاید کچھ کھانے کے لیے پہلے سے ہی گھر میں اہتمام ہو تو کھائے بنا کیسے سو جائے گی۔ ابھی تو کافی دن چڑھا ہوا تھا۔ واقعی وہاں کے وقت کے مطابق دن کے ایک بجے فلائیٹ ایئر پورٹ پر لینڈ کر چکی تھی۔ ہم لوگوں نے بھی اس جہاز سے اتر جانا تھا۔ ایئر لائن کی جانب سے شیرٹن میں چھ یا سات گھنٹے گزارنے کے بعد لفتیزہ کی فلائیٹ سے ہی ریوڈی جنیرو جانا تھا جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔

امیگریشن سے نمٹنا ضروری تھا۔ پاسپورٹ دکھانے بہت ہی ضروری تھے۔ گو کہ سامان خود بخود دوسری فلائیٹ میں شفٹ ہو جانا تھا۔ صرف دستی سامان ہمارے ہاتھ میں تھا مگر ایک چیز کی بے حد کوفت ہوتی ہے کہ اپنے ملک میں کہیں چلے جائیں تو پاسپورٹ کی پرواہ نہیں کی جاتی مگر کبھی بھی دوسرے ملک میں چلے جائیں پاسپورٹ ہر جگہ دکھانے پڑتے ہیں اور یوں جانچ پڑتال کی جاتی ہے جیسے اس ملک میں کوئی واردات کرنے آئے ہیں۔ خیر ان کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔

فرینکفرٹ کا شیرٹن ہوٹل

فرینکفرٹ کا ایئر پورٹ بھی چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ سامان کو ٹرالی میں رکھ کر معلوماتی کاؤنٹر سے شیرٹن کا پتہ پوچھا تو حیرانگی

ہوئی کہ ائیر پورٹ سے منسلک راہداری تھی۔ جدھر جانے کے لیے کہا گیا تھا اس راہداری کو جو کہ کافی لمبی تھی عبور کیا ہی تھا کہ ہوٹل شیرٹن کا ریسیپشن آ گیا تھا۔

انہوں نے کمرے کی چابی دی تو حیرت ہوئی کہ چابی ایک چھوٹے سے کارڈ کی صورت میں تھی۔ ریسیپشن پر مختلف ملکوں کے لوگ صوفوں پر بیٹھے تھے۔ سامان ان کے قریب ہی پڑا تھا یوں لگتا تھا کہ یہ لوگ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرنے کے لیے آئے ہیں۔

ہم بمعہ سامان کے اوپر کی ساتویں منزل پر بذریعہ لفٹ چلے گئے تھے۔ متعلقہ کمرے کے تالے کے قریب سوراخ میں کارڈ کو ڈالا تو تالہ کھل گیا اور ہم کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ کمرے کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے شیشوں کے ذریعے اس قدر خوبصورت منظر دیکھنے کو ملا کہ آنکھیں سارا شہر دیکھ کر دنگ رہ گئی تھیں۔ سارا شہر جو کہ نہایت ہی خوبصورت تھا' سمندر اونچی اونچی عمارتیں' سٹورز' بینک' گارڈن اور کئی اور خوبصورت عمارتیں اپنے حسن کو دوبالا کرتے ہوئے سر جوڑے کھڑی تھیں۔

کمرہ نہایت ہی صاف ستھرا اور آرام دہ تھا۔ اس وقت تو جی کر رہا تھا کہ شہر میں چند گھنٹے گھوما جائے مگر اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ جی کرنے لگا تھا کہ ایک گھنٹہ آرام کر لیا جائے۔

میں نے اپنے شوہر سے کہا۔

''فرینکفرٹ ہم پہلے بھی آ چکے ہیں' کیوں نہ چند گھنٹے اور گھوم پھر لیں۔'' تو انہوں نے بھی کوئی احتجاج نہیں کیا تھا' آہستگی سے جواب دینے لگے۔ ''اگر مناسب سمجھو تو ایک گھنٹہ آرام کر لیتے ہیں اور پھر اس کے بعد کوئی ٹیکسی پکڑ کر شہر چلے جائیں گے۔''

ان کی بات سن کر میں مطمئن ہو گئی تھی۔

بستر پر لیٹتے ہی ہمیں ہوش نہ رہی تھی کیونکہ گزشتہ دو دن سے ہم مسلسل جاگتے رہے تھے۔ ایسے سوئے کہ پتہ ہی نہ چلا تھا۔ کافی دیر سونے کے بعد ہماری آنکھ کھلی تو رات کے آٹھ بجے ہوئے تھے۔ ساڑھے دس بجے ہمارے جہاز نے چلنا تھا۔ جلدی جلدی تیار ہو کر ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں چلے گئے تھیں۔ ہمیں ایک سو بیس ڈالر تک کھانا کھانے کی اجازت تھی۔

شیرٹن ہوٹل کے ڈائننگ ایریا کی جانب پہنچتے ہوئے جب کھانے کے لیے پوچھا تو کاؤنٹر پر بیٹھی حسین لڑکی نے جواب دیا۔

''آپ اگر چاہیں تو یہاں بوفے کھا سکتے ہیں اور اگر جرمن کھانا تناول کرنا چاہتے ہیں تو دوسری سمت مڑ کر بائیں ہاتھ چلے جائیں۔''

کچھ لمحوں کے لیے ہم نے سوچا' پھر ایک دم سے ہی فیصلہ کر لیا کہ جرمن کھانا کھایا جائے۔ اس لڑکی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے جرمن ڈائننگ ہال میں داخل ہو گئے۔ نیچے بیٹھنے کی بجائے ہم نے اوپر بیٹھنا پسند کیا تھا تا کہ اوپر بیٹھ کر نیچے کی رونق دیکھ

سکیں۔لیکن رونق کیا دیکھنی تھی' لوگ بمعہ اپنی فیملی کے چپ چاپ چلے آ رہے تھے۔اتنی خاموشی تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ ہوٹل ہے۔ گوری چٹی خواتین جو نہایت ہی سمارٹ تھیں' شوخ رنگوں کے ملبوسات اور پرل کے زیورات پہنے ہوئے تھیں۔جس میز پر ہم بیٹھے تھے اس کے اردگرد دوسری میزوں پر وہاں کے مقامی لوگ جرمن کھانا کھانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔نہ صرف جرمن کھانا کھا رہے تھے بلکہ ان کی زبان بھی جرمن تھی۔وہ اپنی زبان میں ویٹرس سے گفتگو کر رہے تھے۔ایک خاص قسم کے کھانے کا آرڈر دے رہے تھے۔ہم نے Menu دیکھا تو کوئی بھی کھانا مطلب کا نہیں لگ رہا تھا۔مگر جہاز میں چلنے کے لیے تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔سلاد اور سبزیوں کی ڈش کا آرڈر دے دیا تھا۔ویٹرس آرڈر لے کر چلی گئی تھی۔چند لمحوں کے بعد وہ کولڈ ڈرنک لے کر آ گئی تھی۔اس نے آ کر میز پر کوکا کولا کی بوتلیں رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کے کھانے میں آدھا گھنٹہ لگے گا' کیونکہ وہ سپیشل پکایا جائے گا' تب تک آپ کولڈ ڈرنک پئیں۔''

اف یہ گوشت!

ہم نے کولڈ ڈرنک پینی شروع کر دی اور اوپر بیٹھے ہوئے جرمن لوگوں کا جائزہ لیا وہ چپ چاپ بیٹھے تھے' وائن اور شیمپین پی رہے تھے۔ویٹرس پھرتی کے ساتھ ادھر سے ادھر پھر رہی تھیں۔کالی سکرٹ اور سفید بلاؤز پہنی ہوئی تھیں۔نہ صرف حسین تھیں بلکہ سمارٹ بھی تھیں۔میں کھانے کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ میری اگلی میز پر ویٹرس ایک گرم پلیٹ رکھ کر چلی گئی تھی۔گرم تھالی سب میزوں پر رکھتی جا رہی تھی۔اس کے بعد نمک مرچ اور لیموں سلاد رکھ کر ویٹرس کچن میں جلدی سے گھس گئی تھیں اور ٹرے میں کچا گوشت بہت سی پلیٹوں میں لے کر آ گئی تھی۔ہر میز پر کچا گوشت رکھتی جا رہی تھی۔گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے ان کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔میری اگلی میز پر ایک جوڑا بیٹھا ہوا تھا انہوں نے مرچ مصالحہ پلیٹ پر چھڑکا اور گوشت کو چھری کی مدد سے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا اور پلیٹ میں رکھ کر الٹا سیدھا کیا اور دو تین مرتبہ اسی طرح کر کے وہ پیس یعنی ٹکڑا کانٹے کی مدد سے منہ میں ڈال کر مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیا۔اس کے شوہر نے بھی چھوٹا سا ٹکڑا کاٹا اور پلیٹ پر الٹ پلٹ کر کے اس کو گرم کیا مصالحہ چھڑکا اور کچا ہی کھا لیا۔میں نے حیرت سے ان کو کھاتے ہوئے دیکھ کر اپنے میاں سے پوچھا۔

''کمال ہے اتنے نفیس لوگ دکھائی دے رہے ہیں' مگر نہ جانے اس طرح کا کھانا کیسے کھا لیتے ہیں۔''

''تمہارے لیے یہ کھانا اچھا نہیں مگر سامنے دیکھو وہ دو بوڑھے بھی یہی کھا رہے ہیں۔دو بوڑھے ہی نہیں بلکہ دائیں جانب ایک پورا کنبہ بیٹھا ہوا بڑی رغبت سے کھانا کھا رہے تھے۔چاروں طرف اسی قسم کا کھانا کھایا جا رہا تھا۔صرف ہمارے لیے سبزیاں پکی پکی

پکا کرلائی تھی۔ جو غنیمت جانتے ہوئے ہم نے کھانی شروع کردی تھیں۔ اس ویٹرس نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ لوگوں کے لیے اس قسم کا کھانا لے آؤں؟"

میں نے اس کی جانب دیکھا تو اس کے لبوں پر مسکان تھی۔ بھورے بالوں کی لٹ اس کے رخساروں کو چھو رہی تھی۔ وہ اتنی مہذب دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"بس یہی کھانا کافی ہے' اگر ہوسکے تو کھانے کے بعد چائے لے آئیں۔"

وہ میاں کی جانب مخاطب ہوئی۔ "آپ کے لیے کیا لاؤں؟"

"کافی" انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔

ابھی ہم کھانا کھا ہی رہے تھے کہ میں نے دیکھا تمام لوگوں نے ان کے سامنے رکھا ہوا گوشت چٹ کرلیا تھا۔ میں اس بوڑھے جوڑے کی طرف دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ چلو مان لیا کہ جرمن لوگوں کا یہ خاص کھانا ہے اور وہ رغبت سے کھاتے ہیں مگر کیا وہ بوڑھا جوڑا اس کو رات کے وقت ہضم کرلے گا۔ ان کے معدے اتنے طاقت ور ہیں جو ہضم کرلیں گے۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ وہ ویٹرس چائے لے کر آ گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کس قسم کا کھانا ہے؟"

"یہ جرمنی کا خاص کھانا ہے' لوگ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔"

میں ابھی تک حیران تھی۔

میں نے آگے کچھ بھی نہ پوچھا۔ چائے کے بعد بل ادا کیا۔ ہوٹل کے کمرے سے اپنا سامان اٹھایا اور ائیر پورٹ کی جانب جانے کے لیے لفٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ نیچے پہنچے ہی تھے کہ لفٹ کے قریب ایک سامان رکھنے کی ٹرالی کھڑی تھی۔ دو بیگ پر مشتمل ہمارا دستی سامان تھا وہ ٹرالی میں رکھا اور لف تیزہ کے کاؤنٹر کی جانب چل پڑے۔

ریو کو روانگی

صاف ستھرا ائیر پورٹ' چمکتے فرش' بے شمار لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر ائیر لائن کے کاؤنٹر پر لوگ لائنوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ ٹرالیوں میں اپنا سامان رکھا تھا۔ اپنا متعلقہ جہاز پکڑ کر منزل مقصود پر جانا چاہتے تھے۔

اسی طرح لف تیزہ کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کیا۔ لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر ایسا لگنے لگا جیسے ساری کائنات یہاں ہی

سمٹ کر آ گئی ہو۔

بورڈنگ کارڈ حاصل کرتے ہوئے سامان پکڑا اور جہاز میں بیٹھ گئے تھے۔ جہاز کے چلنے کے بعد اناؤنسمنٹ ہونے لگی تھی کہ ریوڈی جنیرو بارہ گھنٹے میں پہنچیں گے۔ بارہ گھنٹے کا سن کر جان ہوا ہوگئی تھی۔ مسلسل دو دن سے سفر کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ بدن کی ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ جائیں گی۔ مگر انسان بھی کیا شے ہے' قدرت نے اس کو اتنی صلاحیت دی ہے کہ وہ ہر ماحول میں گزارہ کرسکتا ہے۔

وہی مسافر۔۔۔۔۔۔۔اور اسی قسم کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ موٹی حسینہ اپنی منزل پر پہنچ گئی تھی۔ اور خدا کا شکر ادا کر رہی ہوگی کہ اس نے اس کٹھن سفر سے نجات دلائی۔ اس خاتون کی سیٹ پر ایک اور خاتون بیٹھی ہوئی تھی اس کے ہمراہ چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔ وہ بوتل سے دودھ پی رہا تھا۔ اور عورت کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی جیسے وہ زبردستی سفر کر رہی ہو۔

بائیں جانب کی سیٹوں پر کچھ لڑکے اور لڑکیاں' شاید یہ لوگ وکیل تھے اور کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے ریو جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر شادمانی تھی اور خوشی سے چہرے دمک رہے تھے۔

صد افسوس ظالم مردوں پر

اس خاتون کا چہرہ دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ میرے بالکل ہی قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ سوچا اس سے بات چیت کی جائے مگر اس کی اداسی دیکھ کر ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ کچھ پوچھا جائے۔ ایک دوبار اس نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھا بھی تھا مگر حوصلہ مند خاتون دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور میرے لباس کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"آپ انڈیا سے ہیں یا پاکستان سے؟"

"میں پاکستانی ہوں۔"

"اوہ" اس کے لب ملے۔ "میں نے پاکستان نہیں دیکھا ہوا۔۔۔۔۔۔۔کیسا ملک ہے؟"

"ہمارا ملک ہے' ظاہری بات ہے کہ ہمیں اچھا لگتا ہے۔"

وہ بڑے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "آپ ریو کس سلسلے میں جا رہی ہیں؟"

"میرے شوہر کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں اور میں بھی شرکت کروں گی۔"

"گڈ"

وہ بڑی شستہ انگریزی بول رہی تھی۔

''آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟''

''میں برازیل میں رہتی ہوں۔''

''یہ بچہ۔۔۔۔۔۔۔۔؟''

''میرا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کافی اداس ہو گئے تھی۔ اس کی اداسی کو دیکھتے ہوئے مجھ میں جرات پیدا نہیں ہو رہی تھی کہ اس سے کچھ پوچھوں۔ وہ خاموش ہو چکی تھی۔

''ایک ہی بچہ ہے آپ کا؟''

''جی'' وہ خود ہی بتانے لگی۔

''شادی کو دو ہی سال ہوئے ہیں۔ زندگی بڑی اچھی گزر رہی تھی کہ میری ملاقات اپنے ہی سٹور میں ایک پاکستانی لڑکے سے ہو گئی تھی۔ وہ کافی ہینڈسم اور محنتی تھا۔ میں اسے پسند کرنے لگی تھی۔ وہ لڑکا بھی مجھ میں خاصی دلچسپی لیتا تھا۔ جلد ہی ہماری شادی ہو گئی تھی حالانکہ شادی میں ہم لوگ اتنی جلدی نہیں کرتے ہیں' سوچ سمجھ کر شادی کرتے ہیں۔ مگر ادھر میں نے ہاں کہی ادھر جھٹ سے اس نے مجھ سے بیاہ کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد میرا بیٹا پیدا ہو گیا۔ تب بھی وہ مجھ سے بہت ہی خوش تھا۔ ہم دونوں پر مسرت زندگی گزار رہے تھے۔

اچانک جہاں وہ کام کرتا تھا یعنی جس سٹور میں ہم دونوں مل کر کام کرتے تھے' وہاں سے اس کی کسی وجہ سے نوکری چھوٹ گئی تھی۔ وہ فرینکفرٹ سے یہاں پر جاب کرنے آیا تھا اور اپنے آپ کو پاکستانی بتاتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ میں فرینکفرٹ چلا جاتا ہوں وہاں کسی نہ کسی ملازمت پر فائز ہوتے ہی تمہیں اطلاع کر کے بلوا لوں گا۔ میں نے بھی اجازت دے دی تھی۔ جاتے وقت میں نے اس سے کہا کوئی پتہ تو دیتے جاؤ' جہاں پر تم سے رابطہ قائم کر سکوں تو جاتے جاتے ایک پتہ میرے ہاتھ میں تھما گیا تھا۔ میرا بیٹا چھ ماہ کا ہو چکا تھا مگر میرے شوہر نے مجھ سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ میں اس کی جانب سے بڑی ہی فکرمند تھی۔ چند چھٹیاں لیں اور فرینکفرٹ اس کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچ گئی مگر وہاں جا کر مایوس ہونا پڑا کہ اس نام کا کوئی بھی شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ کافی ڈھونڈا میں نے مگر بے بسی کے عالم میں مجھے واپس آنا پڑا ہے۔ برازیل کی لڑکیوں سے شادیاں تو کر لیتے ہیں مگر اکثر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ بچے بھی ہمیں ہی پالنے پڑتے ہیں۔ میں تو یہ بھی سوچتی ہوں کہ شاید اس کی نوکری چھوٹ گئی تھی اور ہمارا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے بھاگ گیا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آ چکے تھے اور میرا دل بسیج سا گیا تھا اور سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی' دنیا کے ہر خطے میں عورت مجبور ہے۔ کتنے ظالم قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو اس طرح بیویوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ ان کے دلوں پر کیا بیتے گی' وہ اپنی اولاد کو کیسے پالے گی۔۔۔۔۔۔۔میری نظر اس معصوم بچے کی طرف اٹھ گئی تھی۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز ننھے فرشتے کی طرح دودھ پی رہا تھا۔ اس بے چارے کو کیا خبر کہ اس کی ماں کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔

میں اس خاتون کے سامنے شرمندگی محسوس کر رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے میرے بھائی نے ہی بے وفائی کی ہو۔ بیٹھے بیٹھے مجھے پاکستانی لڑکوں پر غصہ بھی آنے لگا تھا کہ جہاں بھی جاتے ہیں اپنے ملک کی رسوائی ہی کرتے ہیں۔ میں اتنی شرمندہ ہو رہی تھی کہ میرا جی نہیں چاہا تھا کہ اس خاتون سے نظریں ملاؤں۔ وہ چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی اور یہ آنسو میرے دل پر بھاری تھے۔

برازیل کا شہر "ریو"

جہاز ریو ڈی جنیرو کے ہوائی اڈے پر رک چکا تھا۔ امیگریشن اور سامان کی وصولی کے بعد معلوماتی ڈسک سے لاء کانفرنس کے بارے میں پتہ کروایا تو وہ شیرٹن ہوٹل میں ہو رہی تھی۔ شیرٹن کا کرایہ بہت ہی زیادہ تھا مگر درمیانے درجے کا ہوٹل کوپا کبانہ' شیرٹن کے مقابلے میں آدھی قیمت کا تھا جس کا کرایہ امریکن پچپن ڈالر اور برازیل کے پچاس ڈالر کے برابر تھا۔ ریو میں اس سے کم درجے کا ہوٹل اس قابل نہیں تھا کہ اس میں رہائش رکھی جاتی۔ سامان ٹیکسی میں ڈالا اور ایئر پورٹ والوں کی ہدایات کے مطابق ٹیکسی والے کو تیس ڈالر دینے منظور کر لیے تھے۔

ٹیکسی کوپا کبانہ مار ہوٹل کی جانب چل پڑی تھی۔ میرے شوہر نے اس سے انگریزی میں پوچھتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے کتنی دور ہے؟"

تو ٹیکسی ڈرائیور جو کہ برازیل کا رہنے والا تھا' اپنی زبان میں کچھ بتانے لگا جسے سمجھنا ہمارے لیے نہایت ہی مشکل تھا۔ ٹیکسی چل رہی تھی اور میں نے شہر کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک طرف ساحل سمندر تھا اور سمندر کے دائیں جانب شہر کی اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ اور سامنے پہاڑی پر نظر پڑی تو لوگوں کے رہائشی مکان نظر آئے۔ پرانا شہر تھا۔ میرے ذہن پر یورپ اور امریکہ کا نقشہ کھنچا ہوا تھا مگر یہ شہر تو بالکل ہی مختلف نکلا۔ رہائشی مکان بالکل پاکستان کے متوسط گھرانوں کے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ ٹیکسی اس کے بعد ایک سرنگ نما پل سے گزری اور اس کے بعد سرنگ سے نکلنے لگی۔ پھر عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور بائیں جانب مسلسل ساحل ہمارے ساتھ رواں دواں تھا۔ پہاڑی پر بنے گھر کوئی اتنے خوبصورت نہیں تھے۔ پرانی عمارتیں کھڑی تھیں۔ ہماری

گاڑی نے ایک اور سرنگ کو کراس کیا اور باہر نکلتے ہی شہر کی حدود شروع ہو گئی تھی۔

سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر کچرا بکھرا پڑا تھا۔ اور ملکوں کے مقابلے میں یہ شہر کسی طور پر بھی صاف ستھرا نہیں تھا۔ گو کہ اس قدر خوبصورت مناظر تھے۔ سمندر' پہاڑ اور پہاڑی پر گھر۔۔۔۔۔۔۔ مگر صفائی نہ ہونے کی صورت میں یہ منظر کوئی اتنا خوبصورت دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے افسوس ہونے لگا تھا' کیا فائدہ ہوا کہ اتنا لمبا سفر کر کے صرف گند ہی دیکھنا تھا۔ نہ صرف سمندر ہی تھا بلکہ سمندر سے نکالا ہوا دریا جو سارے شہر کو پھرتا تھا' کہیں کہیں اونچی اونچی عمارتیں نئی بھی تھیں مگر ان سب کے اوپر پرتگالی زبان میں نام لکھے ہوئے تھے۔ کہیں بھی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں پر انگریزی زبان میں کچھ لکھا ہو۔ موسم نہ تو سرد تھا اور نہ ہی گرم۔ دل کو تسلی دی' ہوسکتا ہے کہ یہ ایریا اس قسم کا ہو۔۔۔۔۔۔۔ اور مقامات شاید خوبصورت بھی ہوں۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ ہماری ٹیکسی مین کوپا کبانہ مار ہوٹل کے قریب رک گئی۔

ٹیکسی سے سامان ہوٹل کے دربان نے نکالا اور ہم ریسیپشن کے قریب رک کر کمرہ بک کروانے کے لیے ان سے رجوع کرنے لگے تھے۔ ہوٹل صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ ایئر پورٹ سے ہی انہیں اطلاع مل گئی تھی لہذا کمرے کی چابی ہمارے حوالے کر دی گئی تھی۔ منیجر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہم سے باتیں کر رہا تھا۔ چابی لے کر اوپر پہنچے داخل ہوئے تو اس قدر صاف ستھرا کمرہ تھا کہ حیرت گم ہو گئی تھی۔ ''یہ اگر درمیانے درجے کا ہوٹل ہے تو یہاں کا فائیو سٹار ہوٹل کیا ہوگا۔'' میں نے سوچا۔

مسئلہ زبان

اس وقت دن کے آٹھ بج رہے تھے۔ جلدی جلدی تیار ہو کر نیچے ریسٹورنٹ میں گئے تو وہاں پر بڑے سے ہال میں کافی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ہال کے ایک کونے میں تازہ پھل یعنی تربوز' انناس اور سب سے عمدہ پھل پپیتا تھا۔ اتنا میٹھا اور مزے دار' دنیا جہاں کے جیم' پنیر' مکھن' کولڈ میٹ' ڈبل روٹی' بن' کیک اور مختلف قسم کے تازہ پھلوں سے نکلے ہوئے جوس بڑے بڑے جگوں میں پڑے تھے۔ ریستوران کی چند میزیں بھری ہوئی تھیں اور کچھ خالی بھی تھیں۔ شاید باقی کے لوگ کھا پی کر اپنے اپنے کاموں میں چلے گئے تھے۔ وہاں پر ایک لڑکی جس نے کالی سکرٹ اور سفید بلاؤز پہنا ہوا تھا وہ ہماری میز کے قریب آئی اور پرتگالی زبان میں کچھ پوچھنے لگی تھی۔ ہم دونوں کو زبان کا مسئلہ آڑے آ رہا تھا۔ میرے شوہر نے جلدی سے پوچھا۔

''Can You Speak English''

اس نے انگلش کا لفظ دہراتے ہوئے کہا۔

"انگلش۔۔۔۔۔۔۔۔تو"

میں نے جب اس کی جانب دیکھا تو وہ ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔ میں نے اپنے میاں سے کہا' چائے منگوا لیتے ہیں۔

"برنگ ٹی"

"ٹی؟"

وہ پھر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

ایک ویٹر جس نے سفید پینٹ اور کالا کوٹ پہنا ہوا تھا وہ بھی آ گیا۔ اسے بھی بالکل انگریزی نہیں آتی تھی۔ ہماری زبان تو ایک طرف پرتگالی کے علاوہ شاید وہ کوئی اور زبان بھی نہیں بول سکتے تھے۔ اس ویٹر کو شاید علم ہو گیا تھا کہ یہ پرتگالی نہیں سمجھ سکتے' وہ ریستوران سے باہر لفٹ کے قریب ایک لڑکے کو بلوا کر لے آئے تھے۔ اس لڑکے کا کام ہر ریستوران میں آنے والے کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا اور کمروں میں ٹھہرے ہوئے لوگوں کا نام رجسٹرڈ میں لکھتا۔

وہ لڑکا ہمارے پاس آتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھنے لگا۔

"اینی پرابلم؟"

"وی وانٹ ٹی"

"اوہ"

وہ مسکرایا اور ویٹرس کو پرتگالی زبان میں بتانے لگا کہ انہیں چائے چاہیے۔

برازیل کے لوگ زیادہ تر کافی پیتے تھے انہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ چائے بھی پی جاتی ہے۔ مگر اس ہوٹل میں انہوں نے لپٹن چائے کے احتیاطاً ٹی بیگ رکھے ہوئے تھے۔ ناشتہ کرنے کے لیے میز تک جانا پڑا تھا جہاں پر بہت ساری اشیاء کھانے پینے کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ حسب منشا چیزیں اپنی اپنی پلیٹوں میں ڈال کر لے آئے تھے۔ ویٹرس چائے دم کر کے لے آئی تھی۔ مگر اس کے ہمراہ دودھ نہیں لائی تھی۔ اب میں نے نہ جانے کون کون سی بولیوں سے اسے سمجھایا کہ ہمیں دودھ چاہیے۔ مگر وہ اپنی آنکھیں حیرت سے کھولے اپنی پلکوں کو اوپر نیچے کئے سمجھنے کی کوشش کرنے لگی تھی' مگر سمجھ نہ پائی اور ایک بار پھر ریستوران کے باہر بیٹھے ہوئے لڑکے کو بلا کر لے آئی تھی تو اس نے جب ہم سے پوچھا کہ کیا چاہیے تو اس کو انگریزی زبان میں بتایا کہ ہمیں چائے میں ڈالنے کے لیے دودھ چاہیے تو وہ لڑکا حیران ہو گیا تھا اور حیرت سے پوچھنے لگا۔

"کیا چائے میں دودھ ڈالیں گے آپ؟"

وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

"ہم لوگ دودھ ڈال کر پیتے ہیں۔"

وہ مسکرا پڑا اور پرتگالی میں اسے دودھ لانے کے لیے بتانے لگا کہ چائے میں یہ لوگ دودھ ڈالتے ہیں۔ اس کی حیرت زدہ آنکھیں دیکھ کر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے دودھ نہیں چائے میں ڈالنے کے لیے ہم زہر مانگ رہے ہیں۔

"خدایا۔۔۔۔۔۔!" میں نے اپنے سامنے ٹھنڈے دودھ کو دیکھتے ہی سر پکڑ لیا۔

"ان لوگوں کے آگے سر پٹخنے والی بات ہے۔"

"یعنی بھینس کے آگے بین بجانے والی بات۔۔۔۔۔۔ اچھا چھوڑو گری سردی' اس لڑکے کو ریستوران میں داخل ہونے سے پہلے سب کچھ بتا دیں گے۔ میرے خیال سے ہمارا قیام خوشگوار ہی گزرے گا۔"

مجھ سے نہ رہا گیا تو اس ویٹرس کو دودھ کا جگ اٹھا کر دیتے ہوئے کہا۔ "ہوٹ"

"ہوٹ" اس نے زیر لب بڑبڑایا۔

میں نے اس کی انگلی ٹی پوٹ یعنی چائے دانی پر رکھ دی۔ وہ ایک دم سے مسکرا پڑی اور دودھ لے کر چلی گئی تھی۔ ابھی تھوڑا وقت ہی گزرا ہوگا کہ وہ گرم دودھ لے کر آ گئی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ ایک بار پھر مسکرائی اور گردن کو جھکاتے ہوئے کچھ کہنے لگی تھی۔

میں سمجھ گئی کہ وہ شکریہ کا جواب دے رہی ہے۔ ناشتہ کرتے ہوئے میں نے ہال پر طائرانہ نگاہیں دوڑائیں تو کافی جوڑے اور خاندان بیٹھے ہوئے ناشتہ کر رہے تھے' مگر ان کی گفتگو جو آپس میں کر رہے تھے صاف پتہ چل رہا تھا یا تو پرتگالی زبان یا جرمن اور فرنچ بول رہے ہیں۔ مجھے حیرت اس بات کی ہو رہی تھی کہ ان لوگوں کو ایک لفظ بھی انگریزی کا نہیں آتا۔۔۔۔۔۔ نہ جانے ہمارے بقایا دن یہاں پر کیسے گزریں گے۔ میں نے سوچا۔ ناشتہ کر کے لفٹ کے ذریعے میں نیچے آئی اور ہوٹل کے مینجر سے شیرٹن ہوٹل کا پتہ پوچھا۔ وہاں کے وقت کے مطابق صبح کے نو بجے ہوئے تھے۔ کانفرنس میں شرکت کرنا ضروری تھا۔

ہوٹل کے مینجر نے ڈائریکٹری کھولی اور انگریزی میں ہمیں پتہ بتا دیا تھا۔ جب ہم باہر نکلنے لگے تو ایک دم سے پیچھے سے آواز دی۔

''آپ لوگ یہاں تشریف رکھیں میں ٹیکسی منگوا دیتا ہوں وہ آپ کو وہاں تک بڑے آرام سے لے جائے گا۔''

منیجر کی بات ہمارے دل کو لگی اور باہر کھڑے ہوٹل کے دربان کو اندر بلوایا اور ٹیکسی لانے کے لیے کہا۔

ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ہوٹل کے باہر پیلے رنگ کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے ہوٹل کے منیجر سے میں نے کہا۔

''آپ اس سے پوچھیں کہ ہم سے کتنے روپے لے گا۔''

منیجر نے اس لڑکے کے ذریعے باہر سے کہلوایا تو اس نے بتایا۔''دس ریاز''

یعنی ڈالر کی بجائے ریاز کہتے تھے۔ہم نے امریکن ڈالر منیجر کو دکھائے تو اس نے کہا۔''امریکن ڈالر سے میں ریاز بدل دیتا ہوں۔میرے میاں نے سو ڈالر کا نوٹ اس کے حوالے کیا تو اس کے بدلے اس نے 85 ریاز ہماری ہتھیلی پر رکھ دیئے تھے۔

''ارے یہ کرنسی تو امریکہ سے بھی زیادہ مہنگی نکلی ہے۔''میں نے بڑے تعجب سے اپنے میاں کو کہا۔

وہ مسکرائے اور گویا ہوئے۔

''اس وقت جلدی ہے' ٹیکسی میں بیٹھنے کی کرو۔ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ اپنے نوٹوں میں ان کی کرنسی کو تبدیل نہ کیا کر۔''

لیکن میرے دل میں بار بار آ رہا تھا کہ ہمارے نوٹوں کی کوئی قدر و قیمت اس ملک میں نہیں ہے۔ٹیکسی کے کرایہ سے اندازہ لگا لیا تھا کہ برازیل بہت مہنگا شہر ہے۔

ٹیکسی سڑک پر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔راستے میں کئی ہوٹل اور بڑی بڑی عمارتیں آ ئی تھیں۔جتنی کاریں تھیں' اتنی ہی پیلے رنگ کی ٹیکسیاں سڑک پر چلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ٹیکسی انڈر گراؤنڈ پلوں سے گزرتے ہوئے کھلی سڑک پر پہنچ گئی تھی۔ہوٹل کی واپسی پر دائیں طرف ساحل سمندر اور بائیں جانب عمارتیں تھیں۔

دو چار میل کے بعد سڑک پہاڑ کے دامن میں سے گزرنے لگی۔سمندر اور پہاڑوں کا چولی اور دامن کا ساتھ تھا۔بیچ میں بل کھاتی سڑک جو کہ اونچائی کی طرف جانے لگی تھی۔پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ساحل کے دائیں طرف خوبصورت ہوٹل کھڑا خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

میں نے ٹیکسی سے اتر کر حیرت سے سمندر اور اس کے سامنے ہوٹل کو دیکھا' اتنا خوبصورت لگا کہ میرے دل میں جو گلے شکوے تھے کہ برازیل اتنا خوبصورت نہیں ہے' ہوٹل کے اندر داخل ہوئے تو وہ تمام شکوے دور ہو گئے تھے۔

کانفرنس برائے قانون جرائم

جب ہم شیرٹین ہوٹل پہنچے تو سو سے زیادہ ممالک کے مندوبین بین الاقوامی کانفرنس برائے قانون جرائم میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ یہ تمام مندوبین وکلاء اور ججوں پر مشتمل تھے۔

سب سے پہلا مرحلہ اپنی رجسٹریشن کروانے کا تھا۔ جس میں مندوبین کے ساتھ اس کی بیوی یا کوئی اور شخص مقررہ فیس دے کر اپنے آپ کو رجسٹرڈ کروا سکتا تھا۔ میرے شوہر نے 300 ڈالر اپنے اور 175 ڈالر فیس میری ادا کی۔ جس کے ساتھ ہمیں شناختی کارڈ اور ایک بریف کیس دیا گیا تھا۔ پتہ چلا کہ کانفرنس میں تین اہم موضوعات پر بحث کے بعد ریزولوشن پاس ہوں گے جو کہ یونائیٹڈ نیشن کی جنرل اسمبلی میں پیش کئے جائیں گے۔

پہلا موضوع کمپیوٹر کے جرائم سے متعلقہ تھا۔ دوسرا موضوع ماحولیاتی آلودگی کے جرائم پر مبنی تھا۔ تیسرا موضوع دیگر جرائم کی تفتیش اور انسانی حقوق سے متعلقہ تھا۔ کانفرنس ہال کے باہر کاؤنٹر پر دو لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ہم جب ہال میں جانے لگے تو انہوں نے رجسٹریشن کاغذات کی پڑتال کرتے ہوئے دو سماعت کے آلے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

"ان کی مدد سے آپ اپنی متعلقہ زبان میں تقاریر سن سکتے ہیں۔"

اس آلے کو غور سے دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ انگریزی میں تقریر کہاں ہو رہی ہے؟"

"اس آلے میں مختلف چینل ہیں' ہر زبان کا چینل علیحدہ ہے۔ آپ اس بٹن کو گھما پھرا کر دیکھ سکتی ہیں جہاں پر انگریزی زبان سے تقریر ہو رہی ہوگی بس اسی چینل کو سن لیجیے گا۔"

اس لڑکی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کانفرنس ہال میں داخل ہو گئے تھے۔ بہت بڑا ہال تھا سامنے اسٹیج پر کچھ لوگ صدارت کے لیے بیٹھے تھے۔ پھولوں کے گلدستے ان کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ ان حضرات میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ اسٹیج کے ایک طرف ڈسک پر مائیک کے ذریعے پرتگالی زبان میں کوئی وکیل تقریر کر رہا تھا۔ عین اسٹیج کے سامنے مندوبین جن میں عورتیں' مرد اور وکلاء لڑکے اور لڑکیاں اور کئی جج صاحبان بیٹھے ہوئے تھے' درمیان کی سیٹوں کے بیچ ہمیں دو سیٹیں خالی مل گئی تھیں۔ وہ صاحب جو کہ برازیل کے ہی وکیل تھے' بڑے زور شور کے ساتھ پہلے موضوع پر دلائل پیش کر رہے تھے مگر اس کی زبان سمجھنے کے لیے ہمیں دشواری ہو رہی تھی۔ اچانک اس آلے کا خیال آیا تو اسے کانوں کے ساتھ لگا کر بٹن کو گھمانا شروع کر دیا اور پرتگالی وکیل کی تقریر انگریزی زبان میں ترجمہ ہو رہی تھی' جو کہ واضح طور پر سمجھ میں آ رہی تھی۔ آلہ لگائے میں خاموشی سے سن رہی تھی۔ ہال میں بے حد خاموشی چھائی

ہوئے تھی۔ اگر کسی کو ہال سے باہر بھی جانا پڑتا تو وہ چپکے سے اٹھ جاتا اور کوئی شخص ہال میں داخل ہوتا تو اس کے آنے کی بھی کسی کو خبر نہ ہوتی۔ صحافی حضرات جن میں کئی لڑکیاں بھی شامل تھیں' وہ رپورٹ لکھنے میں مگن تھے۔ ہوٹل میں آئے ہوئے بے شمار فوٹو گرافر موجود تھے جو ادھر ادھر فوٹو کھینچنے میں مصروف تھے۔

اس وقت جرائم کی تفتیش پر تقاریر ہو رہی تھیں۔ ہال کے ایک کونے میں ترجمہ کرنے والوں کی گیلری بھی تھی جو کہ مقرر کی تقریر کا نہایت ہی شستہ انگریزی زبان میں ترجمہ کر رہی تھی۔ ان تمام زبانوں میں صرف ایک انگریزی زبان ہی ایسی تھی جس کو ہم بخوبی سمجھ سکتے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے وہاں بیٹھے بیٹھے اپنی نالائقی کا احساس ہونے لگا تھا کہ کم از کم دوسری زبانوں کے چند لفظ ہی سیکھ کر آنے چاہیے تھے مگر دوسرے ہی لمحے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ انگریزی زبان کو سمجھ سکتے ہیں کیا یہ کافی نہیں ہے۔ ان لوگوں کے لیے بھی تو ہماری زبان مشکل ہے' پھر افسوس کیسا۔۔۔۔۔۔۔ میں نے دل کو تسلی دے ڈالی تھی۔

جب رجسٹریشن کروائی تھی تو ہمیں لنچ کی ٹکٹیں اور شہر کے دورے کی ٹکٹیں فراہم کی گئی تھیں۔

تقاریر ہر زبان میں ہو رہی تھیں۔ لوگ بڑی لگن کے ساتھ ان کو سن رہے تھے۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے کافی بریک ہو گئی تھی۔

مندوبین آہستہ آہستہ ہال سے باہر نکلے اور کافی کی میزوں کی جانب چل پڑے تھے۔

لوگ ایک دوسرے سے مل بھی رہے تھے اور ساتھ ساتھ کافی بھی پی رہے تھے۔ ہمارے علاوہ وہاں کوئی اور پاکستانی نہیں تھا۔ ہر کوئی خندہ پیشانی کے ساتھ مل رہا تھا۔ کافی کی میزوں سے ذرا ہٹ کے دیوار پر مندوبین جو کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے' ان کی تصویریں چسپاں تھیں۔ کافی پینے کے بعد ہر کوئی اپنی فوٹو ڈھونڈ رہا تھا۔ فوٹو گرافر کھینچ کھینچ کر تصویریں دیوار پر لگا رہے تھے تا کہ لوگ اپنی تصویریں دیکھ کر متاثر ہوں اور پانچ ریاز یا دس ریاز دے کر اپنی فوٹو بڑی کروالیں۔

پیسہ بنانے کا بہترین طریقہ اختیار کیا ہوا تھا۔ کافی کے دوران دو خواتین سے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ ایک خاتون جو کہ تیس یا پینتیس کے لگ بھگ تھی' سرخ ٹراؤزر اور سرخ ہی چھوٹے سے کوٹ میں ملبوس تھی' گوری چٹی پر کشش خاتون حیرانگی سے میرے لباس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہمراہ جو خاتون تھی اچھی خاصی تر و تازہ اپنے بھاری جسم پر بلاؤز اور سکرٹ چڑھائے ہوئے تھی۔ میرے شناختی کارڈ کو قمیض کے ساتھ لگے دیکھ کر سمارٹ خاتون نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔

''آپ پاکستانی ہیں؟''

''جی''

"آپ کا لباس بہت ہی خوبصورت ہے۔" اس نے میرے لباس کی تعریف کی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے برابر کھڑی خاتون سے رجوع ہوئی۔

"آپ کے بیج کے مطابق آپ بھی برازیل کی ہیں۔"

مگر وہ خاتون جواب نہ دے سکی اس کو انگریزی آتی ہی نہیں تھی۔ وہ حیرانگی سے میرا منہ دیکھ کر سرخ لباس والی لڑکی سے پوچھنے لگی کہ یہ کیا پوچھ رہی ہیں۔ اس نے پرتگالی میں اسے بتایا تو خاتون نہایت ہی خوش اخلاق تھی' اس نے میرا بیج دیکھ کر اشاروں سے پوچھا۔

"پاکستان؟"

"پاکستان' اس نے پاکستان کا لفظ دہرایا۔ سرخ لباس کی خاتون کا نام لیلا تھا' وہ چند منٹوں میں ہی مجھ سے گھل مل گئی تھی اور اپنے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ وکیل ہے اور برازیل کے شہر ریو میں ہی رہتی ہے۔

"تمہارے والدین بھی برازیل میں ہیں کیا؟"

"والدین اسی شہر میں رہتے ہیں۔ مگر میں ان کے ساتھ نہیں رہتی ہوں' میرا علیحدہ گھر ہے' آزاد خود مختار ہوں۔ میرے والدین بہت اچھے ہیں۔ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔"

"جب آپ کے والدین ہیں تو علیحدہ کیوں رہتی ہیں؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اس لیے کہ اٹھارہ سال تک تو والدین کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ ان کی مرضی کے مطابق ہر کام کرنا پڑتا ہے۔ مگر جونہی پڑھ لکھ کر کچھ بن جائیں تو علیحدہ رہنے میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ ایک تو والدین پر ہم بوجھ بننا پسند نہیں کرتے اور دوسرا یہ کہ ہماری اپنی نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ کئی معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں والدین کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔"

"آپ شادی شدہ ہیں؟" میں نے غور سے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی بڑی بڑی پلکیں ایک دم سے جنبش کھانے لگیں اور لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بتانے لگی۔

"میری شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ ایک تو مجھے اپنی مرضی کا شوہر آج تک ملا ہی نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ دنیا کے کسی خطے میں بھی چلے جائیں تو آدمی مرد ڈومی نیٹنگ (Dominating) ہی ملے گا۔ اب اتنا پڑھ لکھ کر اپنی زندگی بنائی ہے' میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتی کہ میرے اوپر کوئی حکومت کرے۔"

میں نے اس کی بات کا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسا شوہر مل جاتا جس پر آپ حکومت کرسکتیں۔''

وہ ہنس کر بولی۔ ''یہ برازیل میں رہنے والے بھی تیسری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ میری حکومت برداشت کرلے۔ پھر اگر برداشت بھی کرلے تو میں اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتی۔ آزادرہ کر دنیا کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔ بچے پالنا میرے بس کا روگ نہیں۔''

مجھے اس کی باتیں سن کر تعجب ہو رہا تھا کہ بظاہر وہ اتنی بااخلاق اور تہذیب یافتہ دکھائی دے رہی تھی مگر اس کے خیالات بڑے ہی سخت قسم کے تھے۔

ان لوگوں سے میری گفتگو جاری ہی تھی کہ میرے شوہر ایک ہندو مندوب کے ہمراہ آ گئے تھے۔ لیلا کا ان دونوں سے تعارف کروایا گیا تھا۔ پاس کھڑی برازیل کی خاتون جو صرف مسکراہٹ سے ہی میرے میاں کو سلام کرسکی تھی، دونوں طرف زبان کا مسئلہ دامن گیر تھا۔ ہندو صاحب کا نام موہن تھا اور اس کانفرنس میں ان کی نمایاں شخصیت تھی۔

''آپ انڈیا سے آئے ہیں؟'' میں نے اردو میں پوچھا۔

انہوں نے اردو ہی میں جواب دیتے ہوئے بتایا کہ وہ کینیڈا سے نمائندگی کرنے آئے ہیں بلکہ آج کے سیشن میں وہ صدارتی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں ایک تھے۔

ان سے علیک سلیک کے بعد ایک اور سٹال جو کہ کانفرنس ہال کے قریب ہی لگا ہوا تھا، کتابوں کا سٹال دکھائی دے رہا تھا۔ ایک کتاب اٹھا کر دیکھی تو وہ زیورات کے بارے میں تھی، پرتگالی زبان میں لکھی ہوئیں تھیں مگر زیورات کو دیکھ کر اندازہ ہونے لگا کہ جیولری کی تفصیلات ان میں درج ہیں۔ سٹال پر ایک لڑکا کھڑا تھا گو کہ اسے انگریزی نہیں آتی تھی مگر مجھے اشارے کے ساتھ اپنے ہمراہ چلنے کے لیے کہا تو میں اس کے پیچھے چلنے لگی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر وہ ایک دکان میں مجھے لے گیا تھا، جو کہ ہوٹل کے اندر ہی تھی۔ دکان میں چھوڑ کر وہ واپس اپنے سٹال پر چلا گیا تھا۔

دکان کے شوکیسوں پر میں نے بڑی ہی نایاب جیولری دیکھی۔ زمرد، ایمرل، ہیرے اور نہ جانے کتنے قسم کے قیمتی پتھر تھے جن سے یہ زیورات بنے تھے۔

میں بڑے غور سے ان زیورات کو دیکھ رہی تھی کہ کاؤنٹر پر کھڑی خوب صورت سی لڑکی نے مجھے رجوع کیا۔

''آپ کو پسند آئے زیورات؟''

میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا تو وہ بڑی شستہ انگریزی بول رہی تھی۔

میں نے خدا کا شکر کیا کہ کوئی اور بھی انگریزی میں بات چیت کر سکتا ہے۔

''مجھے تو یہ زیورات بہت ہی پسند آئے ہیں۔''

''آپ اگر چاہیں تو جہاں پر یہ زیورات بنتے ہیں اس فیکٹری میں ہم آپ کو بھیج سکتے ہیں' جس وقت آپ فارغ ہوں تو وہاں جا کر زیورات دیکھ سکتی ہیں۔ اتنے خوبصورت ستون جو کہ ایمسٹرڈیم کے خاص ستون ہیں ان میں زیورات آپ کو بنتے ہوئے دکھائے جائیں گے۔ اور بڑے بڑے قیمتی پتھر بھی آپ کو دیکھنے کے لیے ملیں گے۔''

میں نے اسے جواب دیا۔

''ضرور۔۔۔۔۔۔۔۔ دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے' میں اپنی پہلی فرصت میں ضرور دیکھنے کے لیے جاؤں گی۔''

وہ بہت ہی خوش دکھائی دینے لگی تھی۔ ایک دم سے پوچھنے لگی۔

''آپ کب جائیں گی وہاں؟''

''یہ میں اپنے شوہر سے پوچھ کر بتاؤں گی۔''

''آپ گاڑی کی فکر نہ کریں' گاڑی پر پہنچانے کا ذمہ ہمارا ہے اور واپس جہاں جانا چاہیں گی گاڑی آپ کو چھوڑنے بھی جائے گی۔ پلیز زیورات کی فیکٹری میں ضرور جایئے گا۔''

''جی ضرور''

میں نے جلدی سے پیچھا چھڑایا اور سوچا۔ ابھی تو پہلا ہی دن تھا تو زیورات کے چکر میں پھانسا جا رہا ہے۔ پھر میاں کے غصے کا بھی خیال ستا رہا تھا۔ جلدی سے واپس مڑی تو کانفرنس ہال میں تمام مندوبین جا چکے تھے۔ میں بھی ہال میں داخل ہوتے ہوئے میاں کو ڈھونڈنے لگی تھی۔ وہ اس وقت مائیک پر کھڑے کسی موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ میں اگلی نشستوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی تھی۔ اس موضوع پر جس پر میرے میاں بحث کر رہے تھے' غور سے سننے لگی تھی۔ یہ سیشن دن کے ڈیڑھ بجے تک جاری رہا تھا اس کے بعد کھانے کا وقفہ ہو گیا تھا۔

پرانا ریڈ انڈین مصالحہ جات اور کافی کا دیس جنوبی امریکہ کے ساحل پر واقع ریو ڈی جنیرو (Rio) سفید ریت کے ساحل پر تمام

شہر کی عورتیں' بچے' مرد ستارہ ہوتے ہیں۔ پرتگالیوں نے اپنی جہاز رانی کی مہارت کی بنا پر برازیل کو تلاش کیا اور پھر وہاں پر اپنا تسلط جمالیا۔ پرتگالی تہذیب وتمدن کے آثار سے یہ شہر مالا مال ہے۔ آزادی کے باوجود بھی پرتگال کے کلچر سے لوگوں کو آزادی نہیں مل سکی۔ اس کلچر کے واضح نشانات کثرت سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ طرز عمارت' بودو باش' زبان اور لوگوں کے مختلف طور طریقے پر واضح پرتگالی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ برازیل ایک وسیع ملک ہے جس کے شہر اور زمین کو قدرت نے ہر قسم کی دولت سے مالا مال کیا ہوا ہے۔ اس کے باوجود انتہائی غربت اور انتہا کی امارت نظر آتی ہے۔ اس شہر کے وسیع حصہ کے دونوں طرف سمندری ساحل ہے اور دوسری طرف سرسبز پہاڑ ہیں۔ شہر کے وسط میں نمکین پانی کی جھیل ہے جو کہ سمندر سے ایک نہر نکال کر بنائی گئی ہے اور اس جھیل کے چاروں طرف کمرشل ایریا ہے جہاں پر بڑی بڑی بلڈنگیں تعمیر کی گئی ہیں۔ اس شہر کا صحیح نظارہ پہاڑ پر جا کر ایک عجیب وغریب سماں پیدا کرتا ہے۔ اور جو سب سے خوبصورت مقام ہے وہ اس شہر میں ہوٹل شیرٹن ہے جو کہ سمندر کے ساحل پر واقع ہے۔ جہاں پر آج کل کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ چاروں طرف رونق ہی رونق تھی۔ ہوتی بھی کیوں نہ گیارہ سو لوگ شیرٹن میں جمع تھے۔ کھانے کا وقفہ ہو چکا تھا۔ جوان' بوڑھے طلبا اور طالبات ہر ملک کا باشندہ وہاں موجود تھا۔ ڈائننگ ہال کے باہر گیٹ پر ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ لنچ کے کارڈ دیکھتی اور اس شخص کو اندر آنے کی اجازت دیتی تھی۔ ایک لمبی سی لائن لگی ہوئی تھی' باری باری اپنے کارڈ دکھاتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔

ہم بھی اسی طرح اندر پہنچ گئے۔ بوفے کے سٹال لگے ہوئے تھے۔ بے شمار سلادیں اور قسم قسم کے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ چند سیڑھیوں چڑھ کر کھانا کھانے کی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ڈائننگ ہال میں اس قدر نظم وضبط تھا کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اتنے لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ کچھ لوگ جو باقی رہ گئے تھے وہ قطار کی صورت میں کھڑے بوفے کے میز سے باری باری کھانا اپنی اپنی پلیٹوں میں ڈال رہے تھے۔ ہم بھی کھانا لے کر شیرٹن کے ڈائننگ ہال کے اس کونے میں بیٹھ گئے تھے جہاں شیشوں کے ذریعے سمندر کی لہروں کو غور سے دیکھ سکتے تھے۔ اس وقت سمندر بھی نظم وضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس قدر خوبصورت منظر تھا کہ جی کرتا تھا وہیں پر بیٹھے رہیں۔ صاف شفاف سفید ریت پر آتی ہوئی لہریں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا اور اس خوبصورت منظر میں محو ہو گئی تھی۔

ہر ملک کے آئے ہوئے لوگ اپنی اپنی زبان میں بات چیت کر رہے تھے۔ کوئی بھی تو ارد گرد کی میز پر ایسا نہیں تھا جو انگریزی میں بات چیت کر رہا ہو۔

کئی طالبات دور دراز کے ملکوں سے آئی ہوئی تھیں۔ نئی دنیا اور میرے لیے نئے لوگ تھے۔ سفید کوٹ اور کالی پتلونوں میں ویٹر لڑکے تیزی سے میزوں پر مشروب کی بوتلیں رکھ رہے تھے۔ اگر ان سے کچھ پوچھنا چاہو تو وہ پرتگالی میں جواب دیں گے۔ ہمارے لیے قدم قدم پر زبان کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ مانگو کچھ اور لاتے کچھ تھے۔

''اگر یہاں آنا ہی تھا تو کچھ ان کی زبان کے لفظ سیکھ لینے چاہیے تھے۔'' میرے میاں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''دو دن میں پروگرام بنا ہے۔ اتنی جلدی زبان تھوڑی سیکھی جاتی ہے۔'' میں خاموش ہو گئی تھی۔

سامنے نظر پڑی تو ایک انتہائی بوڑھا جوڑا شکل وصورت سے یورپین دکھائی دے رہا تھا۔

میم نے زبردست قسم کے پرل اور میچنگ لباس جو کہ ایک چھوٹے سے کوٹ اور سکرٹ پر مشتمل تھا۔ پیلے رنگ کے گہرے اور شوخ کپڑے اپنی عمر کی مناسبت سے شوخ پہنے ہوئے تھے۔ مگر اس کا دل جوان تھا پاس ہی اس کا شوہر بیٹھا تھا۔ دونوں نے ہی بیج لگائے ہوئے تھے۔ اور بڑی نفاست کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ یہاں کی دنیا اور یہاں کا ماحول بڑا ہی رنگین اور سازگار تھا۔ ہر کوئی خوش اور شادمان دکھائی دے رہا تھا۔ لڑکیاں اور لڑکے کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔

بوڑھا جوڑا بھی انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ مگر میری میز کے قریب جو خاتون بیٹھی تھی وہ نہایت ہی افسردہ دکھائی دے رہی تھی۔ خاموش تماشائی بنی ہر ایک کی صورت دیکھ رہی تھی۔ کھانا کھانے بھی آئے ہوئے تھے۔ ہر ایک خوش تھا مگر یہ خاتون اتنی اداس کیوں ہے؟ میرے دل کو چوٹ سی لگی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ جونہی میرے میاں اٹھے تو میں اس خاتون کے پاس جا بیٹھی تھی۔ مسلسل آدھا گھنٹہ میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتی رہی تھی۔ وہ نہایت ہی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ جونہی میں نے اس سے انگریزی میں بات کی تو فوراً اس نے جواب دے دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس خاتون کے ساتھ میں بات چیت کر سکتی ہوں۔ ورنہ جب سے ریو میں آئے تھے تھے شاذ و نادر ہی ایسے لوگ ہوں گے جن کو انگریزی آتی ہو اردو کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی بول لے یا سمجھ ہی سکے۔ ہم دونوں میاں بیوی جب آپس میں اردو بولتے تو آس پاس کے لوگ حیرانگی سے ہماری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ سوائے پرتگالی کے ان لوگوں کی زبان اور کوئی نہیں تھی۔

عورت کی وفائیں

سانولی سلونی پرتگالی خاتون میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ بے چاری بھی تیسری دنیا میں رہنے والی تھی۔ چہرے کی اداسی سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس کو کوئی نہایت ہی گہرا قسم کا دکھ ہے۔

"آپ برازیل کی رہنے والی ہیں؟"

"جی"

"مجھ سے بات کرنا آپ کو برا تو نہیں لگ رہا ہے؟"

اس نے بڑے غور سے میری جانب دیکھا۔ میرے لباس پر غور وخوض کیا اور دھیرے سے گویا ہوئی۔ "اس وقت میں بالکل تنہا ہوں' میرا بھی جی کر رہا تھا کہ کوئی مجھ سے بات کرے۔"

"میں تو ڈر رہی تھی۔"

"ڈرنے کی کیا بات ہے مجھے بہت اچھا لگا ہے' آپ میرے پاس آئی ہیں۔"

وہ ایک دم سے ہی خوش ہو گئی تھی۔ دبلی پتلی خاتون کی بڑی بڑی آنکھوں اداس تھیں گو کہ اس کے لبوں پر مسکان آ گئی تھی۔ مگر آنکھیں س اس کے دکھ کی چغلی کھا رہی تھیں۔

"آپ ریو میں ہی رہتی ہیں؟"

"جی میں اسی شہر میں رہتی ہوں۔"

"کیا کرتی ہیں؟"

"میں وکالت کرتی ہوں۔"

"آپ کے شوہر۔۔۔۔۔۔؟"

"وہ گھر پر ہیں' کسی حادثے میں ان کی ٹانگیں جاتی رہی تھیں۔"

"اچھا۔۔۔۔۔۔۔وہ کیسے؟"

"بس یہ بھی بڑا ہی المیہ گزرا ہے مجھ پر۔ کسی بھی گھڑی یا پل کی خبر نہیں ہوتی کہ انسان پر کیا بیت جائے۔ میں اور میرا میاں ہولیڈے منانے بریذیلہ جا رہے تھے کہ راستے میں ہی ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ جس لین میں میرا میاں ڈرائیو کر رہا تھا اس کے بہت پیچھے ایک گاڑی بے قابو ہو گئی تھی شاید اس کی بریکیں فیل ہو گئی تھیں۔ اس سے اگلی گاڑی کو زور سے وہ گاڑی لگی۔ ایک دھماکہ برپا ہوا اس سے اگلی اور چھ سات گاڑیاں متاثر ہوئیں۔ اتنے زور کا جھٹکا لگا تھا کہ ہماری گاڑی کا کچومر نکل گیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے ہمیں گاڑی سے نکالا گیا تھا۔ میاں کی جان تو بچ گئی مگر وہ چلنے سے معذور ہو چکے تھے۔ یہ دکھ میرے لیے جان لیوا تھا۔ میرے دو بچے ابھی زیر

تعلیم تھے۔ سارے گھر کا بوجھ میرے کندھوں پر پڑ چکا تھا۔ میں نے اپنے اندر حوصلہ پیدا کیا اور نہ جانے اتنی ہمت مجھ میں کیسے آ گئی تھی۔ دونوں بچوں کو پڑھایا لکھایا اور دونوں نے ہی اپنی مرضی سے شادیاں کر لی تھیں۔ لڑکی بریڈیلہ چلی گئی تھی اور لڑکا فرینکفرٹ ملازمت کے لیے چلا گیا ہے۔ ہم دونوں اکیلے ہی رہتے ہیں۔ زندگی میں بہت سی مشکلات درپیش ہیں۔"

"تو کیا بچے والدین کے پاس نہیں آتے؟"

اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"بچے آنا تو ایک طرف رہا کبھی فون پر حال احوال نہیں پوچھتے۔ ایک روز میں نے بہت پریشانی میں اپنے بیٹے کو فون کر دیا تھا کہ میں صبح کام پر جاتی ہوں اور مجھ سے اکیلے ان کو سنبھالا نہیں جاتا تم کوشش کر کے ریوٹرانسفر کروالو تو.........."

وہ ادھورا جملہ چھوڑتے ہوئے خاموش ہو چکی تھی۔

"تو کیا کہا اس نے؟"

"اس نے مجھے کہا.......... ماما! اگر آپ کو پاپا کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے تو ان کو اولڈ ہاؤس میں بھیج دیں۔ میں یہاں پر بہت مصروف ہوں۔ ٹرانسفر ہونا مشکل ہے۔ روزی بھی کام پر جاتی ہے اور میں صبح کا گیا شام کو واپس آتا ہوں۔ بالفرض میں آ بھی جاتا ہوں تو ہم لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ان کو سنبھال سکیں۔" مجھے دکھ تو بہت ہوا کیونکہ ہمارے ملک کا دستور بھی کچھ یورپ امریکہ جیسا ہے۔ بچے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ مگر یہاں کی بیویاں بہت ہی وفا شعار ہوتی ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے شوہر کے ساتھ گزارہ کرتی ہیں۔ بچے بھی اپنے والدین کو اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔ مگر میرے بیٹے نے تو مجھے صاف جواب دے دیا تھا' جس کا مجھے دکھ بھی ہوا مگر میرے دل میں بار بار آ رہا تھا' ہو سکتا ہے یہ مجبور ہو.......... کیوں نہ بیٹی کو کہوں وہ تو اسی ملک میں رہتی ہے' اس کا آنا اور سیٹل ہونا مشکل نہیں ہے۔ میں نے اسے بھی فون کیا اور بتایا کہ میں بہت تھک گئی ہوں اور مزید اپنے شوہر کی خدمت نہیں کر سکتی' تم کسی نہ کسی طریقے سے اپنی ٹرانسفر ریو کروالو۔

اس نے بھی اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا۔ "ماما! بچے سکولوں میں داخل ہیں' ایک تو ان کی پڑھائی کا مسئلہ ہے اور دوسرا میرے شوہر کو ریو شہر پسند نہیں ہے وہ اپنی ٹرانسفر کسی صورت بھی نہیں کروائے گا' لہٰذا ان کو کہنا بیکار ہے۔ ہاں میں چند دنوں کے لیے اپنے پاپا کو دیکھنے کے لیے ضرور آ ؤں گی۔"

بیٹی کی باتیں کسی لحاظ سے ٹھیک بھی تھیں۔ وہ اپنے گھر میں سیٹ تھی' میں اتنی خود غرض ماں تو نہیں ہوں اس کو مجبور کرتی جبکہ داماد

ہمارے شہر میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا ایک ماہ کے بعد میری بیٹی کرسمس کی چھٹیوں میں اپنے بچوں کے ہمراہ آ گئی تھی۔ اور ایک ہفتہ رہنے کے بعد وہ واپس بریڈیلہ چلی گئی تھی۔

میں نے بھی سوچ لیا' یہ کٹھن سفر میں نے اکیلے ہی طے کرنا ہے۔ میرا شوہر کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے کہ میں تمہاری زندگی میں رکاوٹ بنا ہوا ہوں تم مجھے اولڈ ہاؤس بھیج دو۔ مگر میں نہیں مانتی۔ جب تک مجھ میں دم ہے میں اس کی خدمت کرتی رہوں گی۔"

اس خاتون کی باتیں سن کر میں بے حد متاثر ہوئی تھی کہ اس کے دل کے اندر بالکل ہماری مشرقی عورتوں کی طرح جذبات بھرے ہوئے ہیں۔ وہی خدمت کا جذبہ تھا۔ اس کا جذبہ اور عظمت دیکھ کر دل ہی دل میں متاثر ہو رہی تھی۔



باب دوم

"ریو" کی سیر

کانفرنس کے منتظمین کی جانب سے شہر کے مختلف مقامات دکھانے کے لیے مندوبین کو کہا گیا کہ وہ باہر کھڑی بسوں میں بیٹھنا شروع کر دیں۔ انگلش' فرنچ اور جرمن مندوبین کے لیے علیحدہ بسوں کا انتظام تھا۔ ہر بس میں ان کی زبان بولنے والی گائیڈ تھی۔ لوگ قطار کی صورت میں ٹور کی ٹکٹ دکھا کر باری باری بس میں سوار ہو رہے تھے۔ اسی طرح باری آنے پر ہم بھی انگلش لوگوں کی بس میں سوار ہو گئے تھے۔ اپنی زبان کی وہاں پر کوئی پہچان ہی نہیں تھی۔ بس میں بیٹھ کر اندازہ ہونے لگا کہ برازیل بھی دوسرے ملکوں کی نسبت کم نہیں ہے۔ نہایت ہی آرام دہ بس تھی۔ صاف ستھری جتنی سیٹیں تھیں اتنی ہی سواریاں اس میں بٹھائی جا رہی تھیں۔ یہ نہیں کہ پچاس لوگ بیٹھے ہیں اور پچاس ہی کھڑے ملیں گے۔ بعض اوقات تو اگر اندر جگہ نہیں ملتی تو اوپر چھت پر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ لوگ ہمارے ملک میں کریں بھی کیا۔۔۔۔۔۔ آبادی زیادہ ہونے کی صورت میں بسوں کی اتنی سہولتیں بھی تو نہیں ہیں۔ ہر ایک کو جانا مقصود ہوتا ہے چاہے چھت پر بیٹھ کر کیوں نہ جائیں۔ خیر بات ہو رہی تھی بسوں میں بیٹھنے والے لوگوں کی۔ وہ صبر و تحمل کے ساتھ بیٹھ چکے تھے۔ ابھی چند سیٹیں خالی تھیں۔ ایک ڈرائیور اور ایک گائیڈ خاتون جو کہ دبلی پتلی 65 سال کے لگ بھگ تھی' مائیک کے ذریعے مسافروں کو خوش آمدید کہتے ہوئے بتانے لگی کہ ابھی چند منٹ مسافروں کا انتظار کریں گے پھر اس کے بعد آپ لوگوں کو یہاں کی مشہور سیر گاہ کوروو ادو (Corovado) لے کر جائیں گے۔

سواریوں کا انتظار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام لوگ بس میں بیٹھ گئے اور بس چل پڑی۔ خاتون نے مائیک سنبھال لیا۔ وہ برازیل کے بارے میں اور خصوصاً اس پہاڑ کے بارے میں لوگوں کو بتانے لگی کہ یہ پہاڑ سٹیچوز آف لبرٹی جو کہ نیویارک میں واقع ہے' مجسمہ آزادی سے بارہ میٹر چھوٹا حضرت عیسیٰ کا مجسمہ تمام شہر سے دکھائی دیتا ہے۔ رات کو سرخ لائٹس لگا کر اس کو منور کیا جاتا ہے۔ اس پہاڑ کا نام کاروو ادو ہے جس کا پرتگال زبان میں مطلب کبرا ہے۔ کیونکہ اس پہاڑ کی ساخت اس قسم کی ہے۔ اس پر جانے کے لیے چھوٹی پٹری والی بجلی کی گاڑی چلتی ہے جو کہ ریو کے نیشنل پارک جنگل سے گزرتی ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ کا مجسمہ ڈھائی تین سو سیڑھیاں چڑھ کر

آتا ہے۔

گائیڈ نے یہ کہتے ہوئے ڈرائیور کو بس چلانے کے لیے کہا۔ میرے قریب ہی دو وکیل خواتین بیٹھی ہوئی تھیں وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے بات چیت کرنے لگی تھیں۔ وہ برازیلہ سے یہاں دوسری مرتبہ آئی تھیں۔ ان کے کہنے کے مطابق یہ جگہ دیکھنے کے لیے لاجواب تھی۔ انہیں ریو شہر بہت ہی پسند تھا۔ جونہی کانفرنس میں شرکت کے لیے ان کو مدعو کیا گیا انہوں نے ریوڈی جنیرو آنے کے لیے حامی بھر دی تھی۔ کیونکہ یہاں کی سیرگاہیں انہیں بہت پسند تھیں۔

میں نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔

''تو کیا واقعی یہ پہاڑ دیکھنے میں بہت عمدہ ہے؟''

''بہت خوبصورت ہے۔''

''اچھا''

میں شہر کو اتنا صاف ستھرا نہیں پا رہی تھی اور پوچھ بیٹھی۔ ''کیا آپ بتا سکیں گی کہ یہاں پر اتنی صفائی کیوں نہیں ہے؟''

وہ خاتون مسکرائی اور جواب دیتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ یہاں پر کتنی غربت ہے۔ لوگوں کو سر چھپانے کے لیے مکان نہیں ملتا۔ بعض لوگ تو فٹ پاتھوں پر پڑے رہتے ہیں۔ یہ جو کوک کے ڈھکن ہیں اس کو اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ جس ملک میں روٹی کا مسئلہ درپیش ہو وہاں صفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہاں البتہ یہاں کے ویو سائٹ سین بہت عمدہ ہیں۔ اتنا خوبصورت ملک ہے جی کرتا ہے کہ بار بار آئیں وہ باتیں کر رہی تھی مگر نہ جانے میرا دل اس کی باتیں سن کر راغب کیوں نہیں ہو رہا تھا۔

بس چل رہی تھی مین روڈ سے گزرتے ہوئے انڈر گراؤنڈ ٹنل سے گزری تو کھلی سڑک پر آ گئی تھی۔ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ بس نے چلنا شروع کر دیا تھا۔ سامنے پہاڑی پر لوگوں کے گھر دکھائی دینے لگے تھے۔ بہت سی عمارتیں سر جوڑے کھڑی تھیں۔ گھروں کا نقشہ بالکل پاکستان کے گھروں کے مطابق تھا۔ گائیڈ خاتون کا گلا خراب تھا اس بے چاری سے ٹھیک طرح سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ سرسبز پہاڑ نیچے سمندر اور ایک طرف بل کھاتی ہوئی سڑک تھی۔ اس وقت کا منظر لاجواب تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج نے اپنی آنکھیں نیم وا کر لیں بادل آسمان پر امڈتے ہی چلے آئے تھے اور ہوا کے ہلکوروں سے درخت جھوم رہے تھے۔ آہستہ آہستہ موڑ کھاتی ہوئی بس کاروواڈو کے ریلوے اسٹیشن پر آ کر رک گئی۔ مسافر اتر کر پلیٹ فارم پر پہنچ گئے تھے۔ ٹرین ابھی تک نہیں آئی تھی۔ لوگوں کی تفریح کے لیے ہر آدھے گھنٹے کے بعد ٹرین پلیٹ فارم پر آتی اور سیاحوں کو لے کر کاروواڈو کے پہاڑ پر لے جاتی تھی۔

ابھی پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ٹرین آ گئی تھی۔ سب لوگ اس میں بڑے آرام سے بیٹھ گئے تھے اور ٹرین چل پڑی تھی۔ لوگ ہنسی خوشی بیٹھے تھے۔ ہر ملک کا باشندہ نظر آ رہا تھا۔ زیادہ تر برازیل کے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ ٹرین کی رفتار تھوڑی سی تیز ہو گئی تھی۔ دونوں طرف سے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے یوں لگتا تھا جیسے مری کے گھنے جنگل سے گزر رہے ہوں۔ حد نگاہ سبزہ ہی سبزہ تھا۔ نیچے دائیں طرف گہری کھائی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ٹرین رک گئی تھی۔ پتہ چلا کہ دوسری ٹرین نے کراس کرنا ہے۔ ابھی پانچ منٹ ہی ٹرین رکی ہو گی کہ دوسری ٹرین سامنے سے گزر گئی تو اس کے بعد ہماری ٹرین چل پڑی تھی۔ کافی سیاح مووی اور کیمرہ سنبھالے ہوئے تصویریں کھینچ رہے تھے۔ اس وقت موسم اور سماں بڑا ہی دلفریب تھا۔ اس شہر کا واقعی صحیح نظارہ پہاڑ کے اوپر سے ہی لیا جا سکتا ہے۔ دو چوٹیوں کے درمیان ہوا میں معلق بجلی کی لفٹ چیئر چلتی ہے اور دوسری طرف پہاڑ پر عیسٰیؑ کا مجسمہ ہے جو کہ ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے۔ نیچے سے کھڑے ہو کر اتنی اونچائی سے مجسمہ نظر آتا ہے کہ آپ کی گردن کے پیچھے سے جھک جاتی ہے مگر مجسمہ پوری طرح دکھائی نہیں دیتا۔ مجسمے کو دیکھنے کے لیے بہت دور جانا پڑتا ہے پھر جا کر صحیح مجسمہ نظر آتا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر میں نے نیچے جھانکا تو سارا شہر بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ گائیڈ کسی لحاظ سے سچ ہی کہہ رہی تھی۔ ایک طرف سمندر اور دوسری طرف پہاڑ اور پہاڑوں پر بنے چھوٹے چھوٹے گھر بہت بھلے لگ رہے تھے ہم دوسرے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے تھے۔ ابھی تو بے شمار سیڑھیاں چڑھنی تھیں تب جا کر مجسمہ کے قریب پہنچنا تھا۔

آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنی شروع کر دی تھیں۔ تمام سیڑھیاں چڑھ چکے تھے اور سانسیں ہماری پھولی ہوئی تھیں۔ اوپر جا کر دم لیا۔ اوپر جا کر نیچے سے شہر اور بھی خوبصورت دکھائی دینے لگا تھا۔ اتنے بڑے مجسمے کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔

چاروں طرف سے گھوم پھر کر ایک طرف آئے تو عین مجسمے کے نیچے ایک کمرے کو دیکھا۔ یہ کمرہ عیسٰی علیہ السلام کی یاد میں بنایا ہوا تھا۔ یہ مقدس کمرہ تھا' بالکل ہماری خانقاہوں کی طرح ۔۔۔۔۔۔ لوگ وہاں پر دعا مانگ رہے تھے۔ ایک لڑکا اور لڑکی اپنی شادی کے لیے عہد و پیمان کر رہے تھے۔ کئی برازیلین لڑکیاں بھی وہاں پر آ گئی تھیں۔ وہ بھی دل ہی دل میں نہ جانے کون کون سی منتیں مرادیں مانگ رہی تھیں۔ نوجوان طبقہ وہاں پر کھڑا دعا مانگ رہا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو سامنے شمع دانوں میں روشنیاں جل رہی تھیں اور خالی کمرے میں چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ مجھے اس مجسمے کے ہاتھ پھیلانے کا مطلب سمجھ میں آ رہا تھا یعنی اپنی مخلوق کے لیے ہاتھ پھیلا کر ان کی خیر و برکت چاہ رہے تھے۔ دیکھا جائے تو وہ ہمارے پیغمبروں میں سے ایک ہیں' اس وقت ہمیں بھی عقیدت ہو رہی تھی۔

ایک خاتون اس کمرے کے ساتھ لگی ہوئی آہ وزاریاں کر رہی تھی۔ نہ جانے اس بے چاری کو کیا دکھ تھا جو یہاں پہنچ کر اس کی آنکھوں کے بند ٹوٹ کر پانی کی صورت میں بہہ رہے تھے۔

ایک خاتون کے ہاتھ میں پھولوں کے گلدستے تھے۔ ڈھیر سارے پھول وہ اس کمرے کی دہلیز پر رکھنے کی بجائے منتظم کو دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''تم یہ کمرے میں رکھ دو۔''

وہ اس وقت مسروری دکھائی دے رہی تھی تو میرے قریب سے جب واپس ہوتے ہوئے گزری تو میں نے پوچھا۔

''آپ اس کمرے کے بارے میں کچھ بتانا چاہیں گی۔''

وہ خاتون بہت ہی مسرور دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت اس نے نسواری رنگ کی پینٹ اور فیروزی رنگ کا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ ادھیڑ عمر کی خاتون آنکھوں میں چمک لیے مجھ سے رجوع ہوئی۔ اس کو بھی انگریزی آتی تھی۔

''یہ عیسیٰ (علیہ السلام) کی یاد میں مقدس کمرہ ہے' یہاں پر کوئی بھی آ کر دعا مانگتا ہے تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ میری بھی کچھ حاجتیں تھیں جو سب کی سب پوری ہو گئی ہیں۔ میں دل میں بڑی خواہش رکھتی تھی کہ ریو میں آؤں اور اس مجسمے کو دیکھوں اور اس کمرے میں آ کر دعا مانگوں۔ وہ حاجت میری پوری ہو گئی ہے۔ اچانک بریذیل سے مجھے لاء کانفرنس کی شرکت کے لیے آنا پڑا ہے۔ اتنی جلدی میری حاجت پوری ہو گئی' یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

''اور کون کون سی حاجت پوری ہوئی ہے؟''

''میں نے ایک امتحان پاس کرنا تھا' وہ اس قدر مشکل تھا میں سمجھ رہی تھی کہ میں اس کو پاس نہیں کر سکوں گی۔ پچھلی مرتبہ جب سیر کرنے آئی تھی تو میں نے یہاں پر دعا مانگی تھی اور اپنے شہر میں جا کر میں نے امتحان دے ڈالا تھا۔ کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے بڑے اچھے گریڈ لیے اور کامیاب ہو گئی۔ اب ایک مرتبہ پھر ادھر آنا ہوا ہے تو میں نے آ کر شکریہ ادا کیا ہے۔''

وہ خاتون یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی اور میری نظر اس خاتون کی جانب اٹھ گئی تھی جو کہ ابھی تک رو رہی تھی۔ نہ جانے اسے کیا دکھ تھا اور وہ اپنے دل کی بات کیا کہہ رہی تھی۔ اس کو یا تو جن سے التجا کر رہی تھی وہ سمجھ سکتے تھے یا اس کا دل جانتا تھا۔ یہ کمرہ ایک قسم کا چھوٹا سا گرجا ہی تھا۔

کارووادو کے ریلوے کا افتتاح 9 اکتوبر 1884ء میں برازیل کے شہنشاہ دوم نے کیا۔ شروع میں بھاپ کے انجن استعمال کئے

جاتے تھے البتہ 1910ء میں ان کی بجائے بجلی کی ٹرینیں استعمال ہونے لگیں۔

کارووادو میں حضرت عیسیٰ کے مجسمے کا افتتاح 1931ء میں اس وقت کے صدر وارگاس نے کیا۔ اس مجسمے کی تعمیر میں پانچ سال صرف ہوئے تھے۔ یہ مجسمہ کارووادو کی پہاڑی پر نصب کیا گیا ہے۔ اس کی اونچائی 2330 فٹ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق مجسمے کا وزن 1145 ٹن ہے۔ اور جو دو ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں ان کے درمیان 92 فٹ کا فاصلہ ہے۔

"ریو" کے فقیر

کوپاکبانہ مار ہوٹل درمیانے درجے کا کہہ سکتے ہیں۔ ہوٹل میں آتے اور جاتے وقت سرخ کوٹ اور گرے پتلون میں لڑکا آنے والوں کو خوش آمدید کہے گا اور جاتے وقت بڑے ہی ادب کے ساتھ آپ کو ٹیکسی میں بٹھائے گا۔ تقریباً دنیا کے ہر کونے میں میں نے سفر کیا ہے۔ اور ہر جگہ کے لوگوں کا جائزہ لیا ہے مگر دنیا میں اگر بہترین کوئی ٹیکسی ڈرائیور ہے تو ریو ڈی جنیرو کا کہہ سکتی ہوں۔ آپ کو زبان کا مسئلہ درپیش ہے، جگہ کا نام معلوم نہیں ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر پتہ کسی کاغذ پر درج ہے تو وہ اس کو دیکھ کر صحیح مقام پر لے جائے گا۔

شام کے دھندلکے چھانے لگے تو ہم نے ہوٹل کے قریب ہی ساحل پر جانے کا سوچ لیا تھا۔ اسی طرح پہلے دن کی طرح منیجر سے بیچ کا نام پرتگالی میں لکھوایا اور ہوٹل سے باہر آ کر ملازم لڑکے کو ٹیکسی لانے کے لیے کہا۔ ابھی چند منٹ ہی انتظار کیا ہوگا کہ ہمارے قریب فٹ پاتھ پر ٹیکسی آن کر رک گئی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ لوگ صبح کے گئے شام تک ساحل سمندر پر انجوائے کر رہے تھے۔ سفید ریت کے ساحل پر ٹیکسی نے ہمیں اتار دیا تھا۔ ٹیکسی سے اتر کر ہمیں حیرت ہو رہی تھی کہ ہمارا ہوٹل ساحل سمندر سے ایک فرلانگ پر تھا اور ہم لوگ بخوبی پیدل بھی آ سکتے تھے۔ اور ٹیکسی ڈرائیور ہمیں انجان سمجھتے ہوئے لمبا روٹ بھی لے سکتا تھا مگر اس نے ذرہ بھر بھی دھوکہ نہیں کیا تھا اور تھوڑے فاصلے پر ساحل تھا، ہم سے پوچھ کر ساحل سمندر پر اتار دیا تھا۔ سمندر کے ساحل پر آ کر اس قدر حیرانگی ہو رہی تھی۔ سفید ریت پر چھوٹے چھوٹے کھوکھے جن پر ناریل اور انناس رسیو کے ساتھ لٹکائے ہوئے تھے، وہاں کے مقامی لوگ جو کہ تیراکی کے بہت شوقین ہیں، اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ وہاں پر موجود تھے۔ دراصل غربت انتہا درجے کی تھی۔ وہ ناریل کا جوس پی رہے تھے اور ساحل کے قریب میز لگی ہوئی تھیں۔ کھوکھے والوں کی آج عید ہی تھی۔ جوس پر جوس اور انناس کے علاوہ مچھلیوں کی ریڑھیاں لگی ہوئی تھیں سمندر کی وجہ سے ہوا میں تیزی آ گئی تھی۔ نمکین سانولے سلونے بدن سمندر کی لہروں میں چھپتے اور نکلتے عجب سماں پیدا کر رہے تھے۔ مچھلیاں مرچ مصالحہ لگا کر کھانے والوں کی بھی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بالکل مجھ کراچی کا کلفٹن یاد آ گیا تھا اسی قسم

کی چیزیں وہاں کھانے کو ملتی ہیں۔مگر تیرا ک لوگوں کی کمی ہے وہاں پر اور سب سے بڑا فرق ایک اور بھی تھا کہ عورتیں صرف بکنیاں پہنیں اور اپنے جسم پر چار یا چھ انچ کی دھوتی باندھے ہوئے ساحل سمندر پر چہل قدمی کر رہی تھیں۔

جب تیز ہوا چلتی تو ان کی دھوتیاں اڑ اڑ جاتیں۔۔۔۔۔۔تو اس وقت میں نے سوچا' اس دھوتی اور بکنی کا بھی تکلف ہی کیا ہوا ہے۔کبھی بھی تیز ہوا کا جھونکا آ سکتا تھا اور سب کچھ اڑا کر لے جا سکتا تھا۔مگر وہاں کے لوگوں میں ایک خاص ٹھہراؤ تھا۔ان کی نگاہیں صرف چھلیوں اور ناریل پر اٹکی تھیں۔اگر یہی کچھ اپنے ملک میں ہوتا تو شاید وہاں پر بھاری فیس دے کر یہ شو دیکھا جا سکتا۔مگر اگور کھٹے والی بات تھی۔ایک طرف تو یہ سب کچھ تھا اور دوسری طرف قطار کی صورت میں وہاں کے قیمتی پتھروں کے نوادرات ریڑھیوں پر سجے تھے۔خاص پتھروں سے بنی چیزیں درخت پرندے جیولری بکس اور چند لکڑی کی بھی چیزیں تھیں۔قیمتی پتھروں کی بنی جیولری صرف ایک ریڑھی پر نہیں تھی بلکہ تمام ریڑھیوں پر اسی قسم کی چیزیں دستیاب تھیں۔۔۔۔۔۔بالکل پاکستان کی طرح آوازیں لگا لگا کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ہم ساحل کے ساتھ چوڑے سے فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے جو کہ کالے اور سفید پتھروں کا پرانا فٹ پاتھ تھا۔ہر جگہ کچرا بکھرا ہوا تھا۔ساحل پر اس قدر ہجوم تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے سارا ریو یہیں پر سمٹ آ گیا ہو۔مگر یہاں پر تو صرف غریب طبقہ آیا ہوا تھا' جو انتہائی امیر لوگ تھے ان کو بھی دیکھنے کا شوق ہوا۔میں وہ علاقہ بھی دیکھنا چاہتی تھی۔

آسمان پر شفق پھیلی ہوئی تھی۔اس کا سارا عکس سمندر پر پڑ رہا تھا۔سانولے بدنوں پر شفق کی لالی پڑنی شروع ہو گئی تھی۔جوان عورتیں خصوصاً برازیل کی اپنے آپ کو بہت فٹ رکھتی ہیں۔شاید غربت ہونے کی وجہ سے انہیں کھانے کے لیے کم ملتا ہے۔مگر ان کے جسم دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنا زبردست خیال کرتی ہیں۔جب سے ریو میں آئی تھیں ان کو غیر ضروری کھاتے پیتے نہیں دیکھا تھا ورنہ امریکہ میں آپ جدھر بھی جائیں ہر کوئی آپ کو کھاتا ہی نظر آئے اور وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔صبح دوپہر شام رات اور تقریباً شاید آدھی رات تک وہ کھاتے ہی چلے جاتے ہیں۔اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے کہ وہ موٹے تازے نظر آتے ہیں۔اور جب سے امریکہ میں ویجی ٹیبل آئل میں چیزیں بننی شروع ہوئی ہیں وہ دل کو تسلی دیتے ہیں کہ آئل کی بنی چیزیں کھا رہے ہیں فکر کی کوئی بات نہیں۔کھا کھا کر ان کے معدے بھی مضبوط ہو جاتے ہیں۔مگر ریو کی عورتوں کو دیکھ کر ان کی سمارٹنس کا راز مل گیا تھا کہ ناریل اور چھلیوں سے شاید گزارہ کرتی ہیں۔جاپان اور پاکستان کی عورتوں کی طرح باوفا بھی ہیں۔وہ تھوڑی آمدنی پر بھی گزارہ کر لیتی ہیں۔

صبح کے وقت کانفرنس میں شرکت کے لیے چلے جاتے تھے۔اور شام کو شہر میں گھوم پھر کر یہاں کے مقامات کی سیر کر لیتے تھے۔اس وقت بھی ساحل کے قریب لوگوں کی سرگرمیوں کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔اتنا لمبا فٹ پاتھ کہ میلوں پھیلا ہوا تھا۔ہوائیں

بدستور تیز اور ٹھنڈی تھیں۔ جو کہ اچھی بھی معلوم ہو رہی تھیں۔ پاکستان سے جب چلے تھے تو خاصی گرمی تھی۔ اتنی گرمی کھا چکے تھے کہ یہ سرد ہوائیں غنیمت معلوم ہو رہی تھیں۔

میں پیدل چلی جا رہی تھی۔ اجنبی ملک اور اجنبی ماحول تھا۔ فٹ پاتھ پر کئی خاندان تیراکی کے بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ دھوتیاں مسلسل اڑ رہی تھیں۔ کچھ خواتین کی بکنیاں بھی کہیں پانی کی لہروں کی نظر ہو گئی تھیں اور وہ بے نیازی فٹ پاتھ پر اپنے بچوں کی انگلیاں تھامے گھروں کو لوٹ رہی تھیں۔

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ ریڑھیوں کے قریب کھڑے دکاندار مسلسل آوازیں لگا رہے تھے۔ شاید ان کی آوازیں بھی پانی کی لہروں میں گم ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ اس وقت ان کی چیزیں خریدتا۔ سبھی لوگوں کو گھروں میں جانے کی جلدی تھی۔

ایک ریڑھی کے قریب سے گزرے تو اس نے پرتگالی زبان میں آوازیں دینی شروع کیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ جونہی آگے کی طرف بڑھنے لگے تو اس نے انگریزی میں پکارنا شروع کر دیا تھا۔ مجبوراً اس کی بات سننے کے لیے میں چلی گئی تھی۔

وہ انگریزی زبان میں بات چیت کرتے ہوئے اس ملک کے سوئنیر دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔

''آپ مسافر دکھائی دے رہے ہیں تو کیا اپنے ملک میں یہاں کی سوغات نہیں لے کر جائیں گے؟''

اس کی بات بڑی معقول تھی۔ میں نے اس کی ریڑھی پر رکھی ہوئی چیزوں پر غور و خوض کرنا شروع کر دیا تھا۔ میرے میاں بھی مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''یہاں کے سوئنیر لینا چاہتی ہوں جب کہ یہ شخص بھی مجبور کر رہا ہے۔''

ریاض نے میری اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے وہاں کھڑے رہے تھے۔ بے شمار چیزیں اور خاصی مہنگی تھیں۔ میں چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی کہ میرے میاں نے اردو میں کہا۔ ''انہوں نے چیزیں بیچنے کی خاطر آوازیں لگانی ہی ہیں تم جہاں کھڑی ہوتی ہو تو ملنے کا نام ہی نہیں لیتی ہو۔''

''اب بے چارہ اتنا اصرار کر رہا ہے تو کچھ تو لینا چاہیے۔'' میاں نے جب میرا ارادہ دیکھا تو ہتھیار پھینک دیئے۔ ہر چیز کی قیمت اس کی بتائی ہوئی قیمت سے آدھی بتاتے تھے۔ سودے بازی کرتے ہوئے ہم نے چند چیزیں بہت ہی سستی لے لی تھیں۔ مختلف

رنگوں کے پتھروں کے پرندے' ایش ٹرے اور لکڑی کی بنی ہوئی چیزیں جو وہاں کی سوغاتیں ہیں۔

چند چیزیں لے کر گھر کی سمت روانہ ہو گئے تھے۔ سامنے ٹریفک لائیٹ کی طرف نظر پڑی تو وہاں پر گھڑی لگی ہوئی تھی جس پر وقت دیکھا تو حیران رہ گئی تھی۔ صرف چھ بجے ہوئے تھے اور اندھیرا پڑ چکا تھا۔ سورج برازیل میں بڑی جلدی غروب ہوتا ہے۔ سامنے کی عمارتوں کی جانب تو نائٹ کلب تھا' جہاں پر سامبا شو ہو رہا تھا۔ یعنی ہمارے ٹائم کے مطابق اس وقت شام کا وقت تھا مگر وہاں پر رات ہو چکی تھی۔ نائٹ کلب کے قریب میریڈن ہوٹل تھا۔ کافی ہجوم اس ہوٹل کے قریب نظر آ رہا تھا۔ شاید لوگ ہوٹل میں کھانا کھانے اور سامبا شو دیکھنے کے لیے آ رہے تھے۔

ساحل سے ہٹ کر سڑک پار کر کے ہم فٹ پاتھ پر گھر کی سمت جا رہے تھے۔ چلتے چلتے میں نے چند غریب لوگوں کو فٹ پاتھ پر بیٹھے یا دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے دیکھا تھا۔ مگر وہ بالکل خاموشی سے کھڑے تھے۔ وہاں سے ذرا آگے کو پاکبانہ کی طرف مڑے تو دائیں جانب انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل تھا۔ وہ بھی درمیانے درجے کا ہوٹل کہہ سکتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر مرینہ ہوٹل تھا۔ کو پاکبانہ کے علاقے میں بے شمار ہوٹل تھے۔ یہ فیشن ایبل علاقہ تھا۔ مار ہوٹل کے قریب پہنچنے ہی والے تھے کہ میں نے چند فقیر اور دیکھے جو خاموش تماشائیوں کی طرح فٹ پاتھ پر لوگوں کو آتے جاتے ہوئے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس ملک میں بے انتہا غربت تھی۔ مگر ایک فقیر ایسا نہیں تھا جو کہ آپ کے پیچھے بھاگا ہو' خدا اور اس کے رسول کے واسطے دیتے ہوں۔ وہ صبر و شکر کے ساتھ اللہ توکل بیٹھے تھے۔ کوئی ان کی جھولی میں ڈال دے تو ڈال دے انہوں نے نہیں مانگنا۔ مجھے ان کو دیکھ کر اپنے ملک کے فقیر یاد آ گئے تھے۔ وہ اس قدر بازار میں جاتے ہوئے پریشان کرتے ہیں کہ آپ کو یہ بھول جاتا ہے کہ خریدنے کیا آئے ہیں۔ ایک روپیہ دیا ہے تو وہ گھوم پھر کر دوبارہ آ جائیں گے اور اگر کہا جائے کہ میں نے پہلے بھی دیا ہے تو شرمندہ ہونے کی بجائے جواب دیں گے' ایک روپے سے روٹی تو نہیں کھائی جاتی' صبح کا بھوکا ہوں' رسول کے صدقے کچھ دے جائیں۔۔۔۔۔۔ تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر دل پسیج جاتا ہے اور اس فقیر کو دوبارہ کچھ نہ کچھ دینے کے لیے دل کرتا ہے۔

ریو کے فقیروں کو دیکھ کر میرا دل پسیج گیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ ان کی مدد کی جائے جو اتنی مفلسی میں بن مانگے زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ مجھے رہ رہ کر ان پر ترس آ رہا تھا۔

عجائب گھر

کانفرنس کا اجلاس جب ختم ہوا تو شہر کی سیر کے لیے باہر بسیں موجود تھیں۔ جرمن' ہسپانوی اور انگلش مندوبین کے لیے علیحدہ علیحدہ

بسوں کا انتظام تھا۔ دو تین روز کے عرصے میں ہر کوئی ایک دوسرے کا واقف ہو چکا تھا۔ حسب معمول گائیڈ خاتون ہلکے نیلے رنگ کا بلاؤز اور گہرے نیلے رنگ کی سکرٹ میں ملبوس آنکھوں میں چمک اور لبوں میں مسکان لیے مائیک کے ذریعے ہمیں بتا رہی تھی کہ آج کی سیر وہ ریو کے مشہور عجائب گھر اور ریو کے مشہور چرچ Catedral De Sebasliao کی کروائیں گی۔

بس سڑک پر چل رہی تھی۔ کشادہ اور بڑی بڑی سڑکیں اور دونوں جانب اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ اور سمندر ہمارا ہم سفر بنا ہوا تھا۔ جس کی لہریں مدھر گیت گا رہی تھیں۔ ہر کوئی بس میں خوش نظر آ رہا تھا۔ باہر کے ملکوں میں لوگ ہر جگہ تفریح کا مقام ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اگر تفریح پر نکلے ہیں تو ایسے بھرپور طریقے سے اس کا مزہ لیتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ نکلتے تو تفریح کے لیے ہیں مگر طرح طرح کے وسوسوں میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ بات کوئی پوچھے گا تو اپنی سوچ میں گم جواب کچھ دیں گے۔ یہ لوگ تو سارا سال اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ موقعہ ملے اور وہ تفریح کے لیے نکلیں۔ مشینی زندگی سے تنگ آ چکے ہیں۔ سارے شہر میں مصنوعی جھیل گھوم رہی تھی۔ اور کہیں کہیں تیراک نظر آ رہے تھے۔ میرے قریب ہی بس میں دو مسافر خواتین بیٹھی ہوئی تھیں' شاید فرینکفرٹ سے ان کا تعلق تھا۔ ماں بیٹی لگ رہی تھیں۔ ماں کو انگریزی نہیں آتی تھی مگر لڑکی نے اپنے سکول میں انگریزی سیکھی ہوئی تھی۔ مجھ سے بات چیت کرتی پھر جرمنی میں ٹرانسلیشن کر کے اپنی ماں کو بتاتی۔ ماں کے لبوں پر بار بار مسکراہٹ آ جاتی تھی۔ لڑکی بتا رہی تھی کہ میری ماں کو بڑا شوق ہے آپ کا ملک دیکھنے کا۔

میں نے اسے دعوت دیتے ہوئے کہا کہ اپنی ماں کو ہمارے ملک میں لے کر آؤ۔

ماں شاید ریو میں رہتی تھی اور بیٹی نے فرینکفرٹ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وکالت شروع ہوئی تھی۔ جب ریو اور پاکستان کے سفر کے بارے میں بتایا تو ایک دم سے وہ اتنی پریشان ہوئی اور حیرت سے پورتگیز زبان میں بیٹی سے کہنے لگی۔

''ان کا ملک اتنی دور ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے تو ایشیا جانے کا بہت شوق ہے مگر ہمارے اتنے وسائل ہی نہیں کہ اتنا کرایہ لگا سکیں۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے اداس ہو گئی تھی۔

میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کی قسمت میں پاکستان آنا مقصود ہے تو وسائل بھی پیدا ہو جائیں گے اور خدا کوئی سبب بھی لگا دے گا۔''

بیٹی نے اپنی ماں کو یہ بات بھی بتا دی تھی۔ وہ خاتون اتنی معصوم تھی کہ ایک دم سے خوش ہو گئی تھی۔ ایک بار پھر اس کا چہرہ ہشاش بشاش ہو گیا تھا۔

فلک بوس عمارتیں راستے سے گزر رہی تھیں۔ یہ ریو کا شاید اندرون علاقہ تھا۔ اس علاقے کا نقشہ نیو یارک سے ملتا جلتا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب پرانے پتھروں کے بنے فٹ پاتھ تھے۔ اور وہاں پر کچرا بکھرا پڑا تھا۔ کہیں کہیں عمارتیں نئی بھی نظر آ رہی تھیں مگر صفائی نہ ہونے کی صورت میں ان کی خوبصورتی دوبالا نہیں ہو رہی تھی۔

اچانک چرچ کے قریب بس رک گئی تھی اور مسافر بس سے اتر کر چرچ کو دیکھنے کے لیے اندر چلے گئے تھے۔ شاید پرتگالی میں چرچ کا نام Catedral De Sebasliao تھا' بالکل گائیڈ خاتون نے صحیح بتایا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوئے تو چرچ کی چھت بھی پرانے زمانے کی گول دائرے کی صورت میں بنی ہوئی تھی۔ جس پر رنگین شیشے جڑے ہوئے تھے۔ سامنے حضرت عیسیٰ کا مجسمہ تھا اور دو موم بتیاں جل رہی تھیں۔ عجب قسم کا تقدس چھایا ہوا تھا لوگ تھوڑی دیر کے لیے چرچ کے بنچوں پر بیٹھ کر دعا مانگنے لگے تھے۔ صدیوں سے نہ جانے کتنے سیاح آتے ہوں گے اور دعا مانگ کر چلے گئے ہوں گے۔ زندگی کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا کوئی آتا ہے اور کوئی دیکھ کر چلا جاتا ہے۔

ابھی ہم لوگ چرچ میں ہی تھے کہ گائیڈ خاتون بلانے کے لیے آ گئی تھی۔

"ابھی میں نے شہر کے کچھ علاقے دکھانے ہیں اور عجائب گھر بھی تو جانا ہے لہٰذا آپ بسوں پر تشریف لے جائیں۔"

اس خاتون کے کہنے کے مطابق ہم لوگ ایک بار بس میں سوار ہو گئے تھے۔ بس چل پڑی تھی۔ ریو کے اندرون شہر سے گزر رہی تھی۔ راستے میں عمارتیں مسلسل اونچی اونچی دکھائی دے رہی تھیں۔ فٹ پاتھوں پر ننگ دھڑنگ لوگ بیچ سے آئے لگتے تھے۔ بے نیازی سے چلے جا رہے تھے۔ نیو یارک کی طرح اس علاقے میں رش نہیں تھا۔ کئی جگہ مجسمے کھڑے تھے اور ان کے درمیان فوارے چل رہے تھے۔ عورتیں اتنی حسین نہیں تھیں۔ سانولی سلونی خواتین جن کے چہروں پر غربت کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں پر لوگ کسمپرسی کی حالت میں رہتے ہیں۔ پاؤں میں جوتی ہے تو پہن لی ورنہ ننگے پاؤں ہی چلی جا رہی تھیں۔

مجھے انہیں دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ دنیا میں طرح طرح کی مخلوق ہے اور یہ لوگ بھی ہمارے دیس کی طرح غریب ہیں۔ گائیڈ خاتون نے میری سوچ کا سلسلہ توڑتے ہوئے کہا۔

"یہ غربت کا علاقہ ہے۔ لیکن جو لوگ امراء ہیں وہ یہاں سے شفٹ ہو گئے ہیں اور شہر کے مضافات میں ساحل کے کنارے جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ واپسی پر وقت ہوا تو وہ بھی دکھا دوں گی۔"

ریو کا یہ علاقہ تو دیکھ لیا تھا بلکہ افسوس بھی ہو رہا تھا کہ یہاں پر لوگوں کو کھانے کے لیے روٹی میسر نہیں ہے۔

بس عجائب گھر کے قریب رک گئی تھی۔ بڑے صبر وتحمل اور حوصلے کے ساتھ لوگ اترے اور گائیڈ کے ہمراہ چلتے ہوئے عجائب گھر کے قریب آ کر رک گئے تھے۔ کچھ لوگ جو پیچھے رہ گئے تھے ان کا بھی انتظار کیا گیا تھا۔ عجائب گھر کے بڑے سے دالان میں جب آئے تو بہت بڑی توپ وہاں کھڑی تھی۔ مجسمے تھے اور دوسری طرف پرانی طرز کا فوارہ تھا جو کہ چل رہا تھا۔ ہم دائیں طرف برآمدے میں آئے تو عجائب گھر کے نگران کھڑے تھے۔ گائیڈ نے بات چیت کرتے ہوئے بتایا کہ میں ان کو عجائب گھر دکھانے کے لیے لائی ہوں' شاید منتظمین نے پہلے سے اطلاع کی ہوئی تھی۔ انہوں نے فوراً اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ اندر جانے سے پہلے میز پر پڑے عجائب گھر کے بروشر پڑے ہوئے تھے ان کو میں اٹھانے ہی والی تھی کہ میری نظر بروشر کے اوپر پڑی تو پرتگالی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے بروشر وہیں رکھ دیا اور اندر داخل ہو گئی تھی۔ داخل ہوتے ہی بڑی سی گیلری تھی۔ اس کا فرش پرانے زمانے کی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ فرش کی چمک دمک سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ اس کو پالش کی گئی ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے تو سیڑھیوں سے لے کر اوپر تک تمام کا تمام فرش لکڑی کا تھا بڑے سے ہال سے آئے تو شوکیسوں میں پرانے زمانے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ پرانے برتن' برازیل کا کاٹن' اس زمانے کے غلاموں کے ماڈل بنے ہوئے تھے کہ غلام کس طرح سے کام کرتے تھے۔ بگھیوں میں گھوڑوں کی جگہ وہ جتے ہوئے تھے۔ اور دوسری گیلری کی طرف آئی تو وہاں کے شوکیسوں میں سونے اور چاندی کے ظروف تھے' جو جوں کے توں رکھے ہوئے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ ابھی تیار ہو کر عجائب گھر میں رکھے گئے ہیں۔

تیسری گیلری میں آئے تو پرانا فرنیچر' ایسے حفاظت سے رکھا ہوا تھا کہ جیسے کسی نے آ کر ان صوفوں پر بیٹھنا ہو' کرسیاں خوبصورت پلنگ اور سنگھار میز جو آج کے زمانے سے بھی زیادہ بھلے لگ رہے تھے۔ اس فرنیچر کی بات ہی کچھ نرالی تھی۔ فرنیچر کے چاروں طرف آہنی جنگلا لگا ہوا تھا تاکہ لوگ اس کو ہاتھ نہ لگا سکیں۔ پرانے زمانے کے پتھر بھی شوکیسوں میں نظر آئے تھے۔ ایک اور گیلری میں آئی تو ایک شوکیس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہوتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ یہ مجسمہ بھی وہاں موجود تھا۔

یورپ اور دیگر ممالک کے چینی کے برتن بھی وہاں پر موجود تھے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اگلی گیلری کی طرف چلی گئی تھی جہاں دیواروں پر فوٹو گراف لگی تھیں۔ کچھ پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ کچھ چیزیں 1770ء کی تھیں اور ہتھیار وغیرہ 1900 کے تھے اور کچھ شوکیسوں میں جو چیزیں تھیں وہ 1783ء کی رکھی ہوئے تھیں۔

کسی زمانے میں یہ کسی پورتگیز کا محل رہا ہوگا۔ بڑا ہی خوبصورت تھا جو کہ پرتگیزی سٹائل کی غمازی کر رہا تھا۔ اور ایک جگہ پر میں گئی تو حیران ہی رہ گئی تھی اس قدر خوبصورت راجے اور مہاراجوں کے بیٹھنے کے لیے بگھی جوں کی توں رکھی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی

کوئی شہزادہ یا شہزادی آئے گی اور اس پر سواری کرے گی۔

زراعت میں استعمال ہونے والے کچھ اوزار بھی تھے۔ یہ چیزیں بڑے قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پرانا پرتگیزی ڈرائنگ روم بھی موجود تھا۔ اس طرح پرانے زیورات اور نوادرات بھی موجود تھے۔ دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں شہزادے اور شہزادیوں کی لگی ہوئی تھیں۔ وہ اتنی عمدگی کے ساتھ پینٹ ہوئی تھیں کہ لگتا تھا کہ وہ ابھی بول پڑیں گے۔ پینٹنگ کم بلکہ نیچرل زیادہ لگ رہی تھیں۔

تمام لوگ گھوم پھر کر محظوظ ہو رہے تھے۔ وہاں کے عجائب گھروں میں یہ عجائب گھر دیکھنے کے قابل تھا۔ ایک تھائی لینڈ کا جوڑا میرے قریب کھڑا پینٹنگ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ میں نے ان سے بات چیت کرتے ہوئے پوچھا کہ "آپ دونوں وکیل ہیں؟"

وہ شخص مسکرا کر جواب دیتے ہوئے بتانے لگا کہ

"وہ تھائی لینڈ میں جج ہے اور اس کے ہمراہ جو خاتون ہے وہ ان کی اہلیہ ہے جو ایک وکیل بھی ہے۔ مجھے بھی وکیل ہی سمجھے ہوئے تھے مگر جب میں نے بتایا کہ میرے شوہر جج ہیں اور میں ادیبہ اور صحافی ہوں تو وہ حیران ہو گئے تھے۔ اس وقت میرے ہاتھ میں کاغذ اور پن تھا۔ میں نوٹس بنا رہی تھی۔ وہ یہ سن کر اتنے خوش ہوئے جیسے ادیب ہونا جج سے بڑا عہدہ تھا۔

وہ اپنی بیوی کو بڑے فخر سے بتا رہا تھا کہ یہ ادیبہ ہیں تو وہ مجھ سے مل کر بہت ہی خوش ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی ------- باہر کے ملک والے فن کی کتنی قدر کرتے ہیں اور ایک ہمارا معاشرہ ہے جو ادیبوں کو کوئی مقام نہیں دیتا ہے۔

ریو کے ریستوران میں ہم لوگ کھانا کھانے کے لیے گئے تو وہاں پر پہلے سے ہی میزیں بھری ہوئی تھیں۔ کافی رش تھا۔ ایک میز پر جان پہچان کے لوگ نظر آئے تو انہوں نے اپنی میز پر ہمیں بلوا لیا تھا۔ تھائی لینڈ کا جج اور اس کی اہلیہ بیٹھے ہوئے تھے۔

ان لوگوں نے پہلے سے ہی آرڈر دے دیا تھا۔ مگر ہم نے ان لوگوں کے کھانے سے گریز کیا اور سوچا بجائے چکن یا گوشت کے مچھلی منگوائی جائے۔ ویٹر آرڈر لینے آیا تو اس نے پرتگالی میں ہم سے پوچھا کہ کیا آرڈر کریں گے۔ ہمیں اس کی کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔ سوچا کہ لمبے چکروں میں پڑنے کی بجائے اس سے مچھلی منگوا لیتے ہیں۔

میں نے اسے کہا۔ ہم دونوں کے لیے مچھلی لے آؤ۔ میری اس بات سے وہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ جب ہم سے کوئی جواب نہ ملا تو چلا گیا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں بڑی بڑی سیخوں پر گوشت کے ٹکڑے بھاپ چھوڑ رہے تھے۔ لگتا تھا تازے تازے بنوا

کرلایا ہے۔

"گوشت نہیں کھانا چاہیے' کیا پتہ کس قسم کا گوشت ہو۔" ہم نے اشارے سے کہا۔ "نہیں چاہیے۔"

اور وہ چلا گیا اور اس کے بعد چکن کی لمبی لمبی سیخیں گرما گرم لے آیا تھا۔ ان کو بھی کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگ ان سیخوں سے گوشت اتار اتار کر کھا رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر میزوں پر وہ سیخیں لے آتے اور چھری سے گوشت کاٹ کر ان کی پلیٹوں میں رکھ دیتے تھے۔ ہمارے قریب جو تھائی لینڈ کا جوڑا بیٹھا تھا ان کو ٹوٹی پھوٹی انگریزی آتی تھی۔ میں نے ان سے کہا۔ "آپ ان کو سمجھائیں کہ ہمیں مچھلی چاہیے۔"

وہ مسکرا کر جواب دینے لگا کہ پرتگالی تو مجھے بھی نہیں آتی ہے۔ اس کی اس بات سے میں سوچنے لگی کہ زبان ایک ایسا رابطہ ہے جس سے ایک شخص دوسرے انسان کے قریب آ جاتا ہے۔ زبان نہ آتی ہو تو دنیا کے کسی خطے میں چلے جائیں تو آپ کو بڑی دشواری پیش آتی ہے' خجالت اور کھسیانے پن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کچھ ایسی کیفیت میری بھی تھی جسے سمجھانا اور سمجھنا ایک دشوار اور کٹھن مرحلہ تھا۔ میری طرح شاید اور لوگ بھی اس ریستوران میں موجود تھے جن کو پرتگالی نہیں آتی تھی مگر وہ ہر چیز مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔ مجھے تو یہ ڈر تھا سور نہ کھالیں۔ لیکن ان لوگوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں نے مچھلی کے فش کا لفظ استعمال کیا تھا مگر وہ سمجھ نہ سکا تھا۔ بڑی کوشش کی سمجھانے کی تو وہ پھر بھی نہ سمجھا۔ ہمارے قریب ہی سیاح نے جب مشکل میں پڑے ہوئے دیکھا تو اس نے جیب سے پن نکالا اور کاغذ پر مچھلی کی تصویر بنائی اور ہاتھ سے تیرنے کی علامت ظاہر کی تو تب بیرے کو سمجھ آ گئی تھی۔ اس نے جواب میں اتنے زور سے گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا کہ "مچھلی کھانے میں شامل نہیں ہے۔"

اس کی بات سن کر میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ یا اللہ کہاں آن کر پھنس گئے ہیں۔ یہاں پر ایک بات سمجھانے کے لیے آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا ہے اگر کسی اور ڈش کو منگوانے کے لیے کہیں گے تو مزید آدھا گھنٹہ لگائے گا۔ میز پر آلوؤں کے چپس اور سلاد رکھی ہوئی تھی۔ دونوں پلیٹوں کو اٹھا کر اس کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لے کر آؤ۔" تو مسکراتا ہوا چلا گیا تھا۔

ریستوران لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کافی سیاح ٹولیوں کی صورت میں میزوں پر بیٹھے تھے۔ چند لڑکے اور لڑکیاں دنیا و مافیا سے بے نیاز کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ جیسے وہ سب میں نہیں بلکہ اکیلے بیٹھے ہوں۔ کھانے کے دوران میوزک بجنا شروع ہو گیا تھا۔

سلاد اور آلوؤں کے چپس ہمارے سامنے رکھے ہوئے تھے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے میں نے ان کو کھانا شروع کر دیا تھا۔

میرے قریب جو خاتون بیٹھی تھی۔ وہ گویا ہوئی۔

"آپ چکن یا بیف کیوں نہیں کھاتی ہیں۔" اب ان کو کیا بتاتی کہ ہم چکن یا گوشت کیوں نہیں کھاتے۔

"ویسے ہی سلاد اور سبزیاں مجھے پسند ہیں۔" یہ کہہ کر انہیں ٹال دیا تھا۔ بیرے اپنا کام کر رہے تھے۔ سیخوں پر سیخیں لا رہے تھے۔ اور وہ لوگ بھی بڑی رغبت کے ساتھ کھا رہے تھے۔

کھانے کے اختتام پر پرتگالی لڑکے اور لڑکیوں نے گیت گانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی زبان میں گیت گا رہے تھے۔ ایک ٹولی کی صورت میں ریستوران کے بائیں طرف جہاں پر جگہ خالی تھی۔ گیت میں مگن تھے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھی' ادھیڑ عمر عورتیں اور مرد سب گیت میں شامل ہو گئے تھے۔ گو کہ گیت کے بول ہماری سمجھ سے باہر تھے مگر کانوں کو بھلے لگ رہے تھے۔

میں بھی اس گروپ کے قریب کھڑی ہو گئی تھی۔ ایک لڑکی جو کہ شکل سے پرتگالی تھی مگر وہ میرے قریب تالیاں بجا رہی تھی' گانے میں شامل نہیں تھی۔

"یہ کون سا گیت گا رہے ہیں؟"

یہ خوشی کا گیت ہے اور برازیلین لوگ اکثر اس کو گاتے ہیں۔ یہ یہاں کا ایک قسم کا مشہور گیت ہے۔

"کون کون سے موقعوں پر آپ گاتے ہیں؟"

"ہر موقعے پر گا سکتے ہیں۔ جب بھی اپنے پیارے دوست کے ساتھ بیٹھے ہوں تو تب بھی یہ گیت گانے کو جی کرتا ہے۔"

"تو کیا آپ بھی یورپ کی طرح دوستیاں لڑکوں کے ساتھ کرتی ہیں۔"

وہ مسکرائی اور بتانے لگی۔

"ہماری دوستیاں تو سالوں چلتی ہیں' ہم ایک دوسرے کو پرکھتے رہتے ہیں دل راغب ہوا تو شادی کر لیتے ہیں ورنہ دوست کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ شادی کے بعد ہم نے ان لوگوں سے نبھاہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ شادی کی اور چھوڑ دیا۔ خوب پرکھ کر شادی کرتے ہیں تاکہ ساری عمر ان کے ساتھ گزارہ کر سکیں۔"

میں حیران ہو رہی تھی کہ بے شک یہ پسند کی شادی کرتے ہیں مگر مشرقی طور طریقے اپناتے ہیں۔

"ہمارے ملک میں بھی لوگ اسی طرح کے ہیں۔"

وہ مسکرائی اور چند لمحوں کے لیے گانا بند ہوا تو بتانے لگی۔

"میری سہیلی نے دو چار ڈیٹ پر ہی گئی ہوگی تو شادی کرلی۔ ابھی شادی کے دو ہی مہینے گزرے ہوں گے کہ اس لڑکے نے اپنے تیور دکھانے شروع کر دیئے تھے۔ وہ بہت برا ثابت ہوا ہے۔ اس کے والدین اور ہم سہیلیاں لاکھ اسے منع کرتی ہیں مگر وہ ثابت قدم ہے اور کہتی ہے کہ میں نے اسے سچے دل سے چاہا ہے' کبھی بھی اس کو نہیں چھوڑوں گی۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اور تمہارا دوست۔۔۔۔۔۔"

"میرا ابھی ہے' میں عرصہ دو سال سے اسے جانتی ہوں مگر میرا حوصلہ نہیں پڑتا کہ اتنی جلدی اس کے ساتھ شادی کرلوں۔ کیا خبر شادی کے بعد وہ بھی میری سہیلی جیسا ہو جائے۔ پھر ساری زندگی ایک بندے کے ساتھ رہنا بڑا ہی دل گردے کا کام ہے۔"

میں مسکرا پڑی اور جواب دیتے ہوئے کہنے لگی۔

"اس کا مطلب ہے ساری زندگی تم اسے پرکھتی ہی رہوگی۔"

وہ ہنس پڑی اور جواب دیتے ہوئے بتانے لگی۔

"وہ سامنے میرا دوست لڑکیوں کے ساتھ گیت گا رہا ہے۔ یہ مجھے بے حد چاہتا ہے مگر میں مزید دو سال اس کو اور پرکھنا چاہتی ہوں۔"

"اگر اچھا ہے تو شادی کرلو۔"

"ابھی نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

گیت بند ہو چکا تھا اور وہ لڑکا اس کے قریب آتے ہوئے پرتگالی میں کچھ کہنے لگا تھا۔ اور وہ اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہاں کے غریب لوگ ہونے کے باوجود بہت ہی آزاد خیال ہیں۔ ریستوران میں کھانے کے بعد بھی گہما گہمی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے سے باہر نظر پڑی تو بارش ہو رہی تھی۔ بادل زور سے کڑک رہے تھے۔ اتنی موسلا دھار بارش تھی کہ اس کے تھمنے کا انتظار کرنے لگے تھے۔

لڑکے اور لڑکیوں نے خوب رونق لگائی ہوئی تھی۔ ایک اور گیت گانا شروع کر دیا تھا۔ باقی کے لوگ ان کے قریب کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگے تھے۔ جوڑوں نے تو باقاعدہ ناچنا شروع کر دیا تھا۔ اس میں بوڑھے لوگ بھی شامل تھے۔ کسی کو بھی گھر جانے کی جلدی نہیں تھی۔

مندوبین میں ایک لڑکی کرسٹینا بھی تھی جو میرے قریب آن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تم بھی برازیل کی رہنے والی ہو۔''

''ہاں میں ریو میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہو۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے سنا تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر علیحدہ ہو جاتی ہیں۔''

''میں اکیلی نہیں رہ سکتی مجھے اپنی ماں سے بہت پیار ہے۔ دوسرا یہ کہ ماں نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا کہ کون آیا اور کون گیا ہے' میری آزادی میں کوئی خلل نہیں پڑا ہے۔''

''تو کیا آزاد رہنے کے لیے اکیلے رہتے ہیں؟''

''بالکل آزادی کے لیے۔۔۔۔۔۔ میری سہیلی جو سامنے بیٹھی ہے وہ اکیلی رہتی ہے۔''

''تو کیا والدین کا گھر اس نے چھوڑ دیا ہے۔''

''جی اس کی ماں بہت دخل اندازی کرتی تھی۔ اس لیے اس نے اکیلے رہنے میں مصلحت سمجھی ہے۔ میری ماما کی کوشش ہوتی ہے کوئی ایسی بات نہ ہو جو مجھے بری لگے۔ بوڑھی ہو چکی ہیں۔ ویسے بھی دنیا میں ان کا کوئی اور نہیں ہے۔ پاپا وفات پا چکے ہیں۔''

اس لڑکی کی باتوں سے میں پریشان سی ہو گئی تھی۔ اس کا ساتھی لڑکا بھی گیت گانے میں مصروف تھا۔ وہ بھی اس کے پاس چلی گئی اور گانے میں شامل ہو کر اپنے ساتھی لڑکے کے ساتھ ڈانس کرنے لگی تھی۔ باہر بارش زور شور سے ہو رہی تھی' اندر نوجوان طبقے نے دھما چوکڑی مچائی ہوئی تھی۔ میں ان کو دیکھ کر سوچ رہی تھی۔۔۔۔۔۔

ہم لوگ ان لوگوں سے کتنے پیچھے ہیں۔ ہمارے ہاں ابھی تک وضع داری ہے۔ ہمارے معاشرے میں لوگ ابھی تک بچوں کی پرورش مشرقی انداز سے کرتے ہیں۔ ہمارے بچے بھی مودب ہیں۔ اگر بزرگوں کی بات بری بھی لگے تو گھر چھوڑ کر علیحدہ نہیں رہتے بلکہ ان کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

برازیل کا دوسرا اہم شہر سوپولو ہے۔ اس شہر کو جانے کے لیے سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ سڑک بنائی گئی ہے اور ریو کے مضافات میں امراء نے ساحل کے کنارے کنارے خوبصورت گھر تعمیر کیے ہوئے ہیں۔ سمندر کے بیچ میں جزیرہ نما شہر بھی ہے اور پہاڑ بھی ہیں۔ دائیں طرف اندرون شہر کے انتہائی غریب لوگ رہتے ہیں۔ بیچ میں شہر آ جاتا ہے۔ مال اور ہوٹل بھی آتے ہیں۔ سمندر اور پہاڑ ادھر بھی ہیں۔ اور دوسری طرف ساحل' پہاڑ اور رئیس لوگوں کے گھر ہیں۔ خدا کی قدرت۔۔۔۔۔۔ وہی چاند' وہی سورج'

وہی پہاڑ اور سمندر امراء کو بھی میسر ہیں اور دوسری جانب یہی چیزیں غریب لوگوں کو میسر ہیں۔ ایک فرق ہے تو صرف امارت کا ہے۔ اور میرے خیال میں یہ سب سے بڑا فرق ہے۔ بہت غریب ہونے کی وجہ سے جرائم کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ موقعہ لگنے پر لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ اکثر لٹیروں کے گھر پہاڑی کی چوٹی پر نظر آئیں گے۔ شام ہوتے ہی وہاں پر خوف وہراس پھیل جاتا ہے۔ جونہی باہر کے علاقے میں کوئی کلا اسے لوٹنے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ اکثر نیویارک کے بارے میں سنا کرتے تھے کہ کالے لوٹ لیتے ہیں' مگر برازیل میں بھی سر شام ہی لوگ کوشش کرتے ہیں کہ جلد سے جلد گھروں کو لوٹ جائیں۔ عورتیں زیورات پہن کر نہیں نکلتی ہیں۔ کوشش کرتی ہیں کچھ نہ پہنا جائے۔

آج گائیڈ کے ہمراہ ہم ایک اور عجائب گھر دیکھنے جارہے تھے۔ راستے میں سوسپولو کی طرف جاتی سڑک کے ساحل پر بس جارہی تھی۔ گائیڈ بہت ہی خوش اخلاق تھی۔ آج وہ بڑے اچھے موڈ میں دکھائی دے رہی تھی۔ امراء کے گھروں سے جب بس گزر رہی تھی تو اس نے مدھر سر پر گیت گانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آواز نہایت ہی دلکش تھی۔ سامنے پہاڑی پر میری نظر پڑی تو اس قدر خوبصورت گھر تھے کہ انہیں دیکھ کر رشک ہو رہا تھا۔ یہ سڑک میلوں پھیلی ہوئے تھی۔ اور گھر بھی میلوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ گھروں کی حدود ختم ہوئی تو بس ایک بڑے سے محل نما گھر کے باہر رک گئی تھی۔

ہم لوگوں نے بس میں سے اترنا شروع کر دیا تھا اور باقی کی دو بسوں میں سے بھی لوگ اترنے لگے تھے کہ یہ بہت بڑا محل تھا۔ ایک فرانسیسی اپنی محبوبہ سے دل برداشتہ ہو کر یہاں آباد ہوا تھا اور عشق کی ناکامی کا مداوا اس نے ایسے کیا کہ مٹی اور لکڑی کے تمام مجسمے بنانے والوں کو اکٹھا کیا اور ان سے اپنا دل بہلانے کے لیے مختلف مجسمے بنا کر اکٹھے کئے اور اس کی موت کے بعد اس بڑے سے گھر کو عجائب گھر بنا دیا گیا تھا۔

ان مجسموں کو دیکھ کر اس فرانسیسی کو داد دینی پڑتی ہے اور ساتھ ساتھ ان کاریگروں کی بھی جنہوں نے اتنی محنت اور لگن سے چیزیں تیار کیں۔ عجائب گھر میں داخل ہو کر مجھے ایک آکیسٹرا موسیقی کا نظر آیا یعنی لکڑی کے شوکیس میں مختلف سازندوں کے مجسمے اپنے اپنے سازوں کے ساتھ ایک آکیسٹرا کی صورت میں دکھائی دیتے تھے۔ اور شوکیس کے باہر ایک بٹن نصب تھا جس کو دباتے ہی برقی رو سے تمام سازندے اپنا اپنا ساز بجانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور موسیقی کی خفیہ ٹیپ چلنی شروع ہو جاتی ہے۔ سے مختلف دھنیں نکلتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ یہ سچ مچ اپنا ساز بجا کر موسیقی کی دھنیں بجا رہے ہیں۔ میں ابھی پہلی گیلری میں کھڑی تھی۔ اس شوکیس کے مجسموں کو دھنیں بجاتے ہوئے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ اور اس فرانسیسی کو دل ہی دل میں داد دے رہی تھی۔ میرے قدم جم سے گئے تھے۔

دھنیں بند ہوجاتی تو میں چپکے سے بٹن دبا دیتی اور ایک بار پھر موسیقی بجنی شروع ہوجاتی تھی۔ میرے میاں دوسری گیلری میں کھڑے تھے۔ مجھے وہاں نہ پا کر ڈھونڈتے ہوئے آئے اور بتانے لگے۔ آگے اور بھی خوبصورت چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔

دوسری گیلری میں گئی تو میری حیرت گم ہوگئی تھی۔ دیوار کے ساتھ لگے کئی شوکیس تھے اور ہر شوکیس میں مختلف مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ مثلاً ایک شوکیس میں لکڑی چیرنے کی ورکشاپ نظر آئی۔ شوکیس کے باہر بٹن پر میرا دھیان چلا گیا تھا اس کو دبایا ہی تھا کہ ایک دم سے لکڑی کے جسموں میں حرکت پیدا ہوئی اور لکڑہارا لکڑیاں کاٹنے لگا تھا۔ جنگل میں لکڑہارا لکڑیاں کاٹ کاٹ کر ایک طرف پھینک رہا تھا۔

اور دوسرے شوکیس میں ایک بارات کو دکھایا ہوا تھا' لوگ' دولہا اور بینڈ باجے والے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس میں ماڈرن ٹیکنالوجی متعارف کروائی گئی ہے۔ بٹن دبایئے تو برقی رو سے تمام آرکیسٹرا دھنیں بجانی شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح لکڑی کی فیکٹری کام شروع کر دیتی ہے اور اسی طرح بارات بھی چلنے لگ جاتی ہے۔

ایک اور شوکیس میں ایک عورت سلائی مشین کے آگے بیٹھی ہوئی ہے۔ بٹن دبانے سے وہ سلائی کی مشین چلانی شروع کر دیتی ہے۔

پرتگالیوں نے برازیل کو اپنے زیر اثر لا کر افریقہ کے حبشی بطور غلام لا کے یہاں آباد کئے اور مقامی آبادی کو بھی غلام بنایا۔ جن سے وہ ہر قسم کا کام لیتے تھے۔ خصوصاً زراعت کے شعبے میں فرانسیسی نے باقاعدہ ایک کافی فارم بھی تیار کروایا' جس میں غلام کام کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ غرض کہ زندگی کے ہر شعبے کی نمائندگی مٹی اور لکڑی کے مجسموں میں دیکھ سکتے ہیں۔

مکان کے باہر پرتگالی زبان میں لکھا تھا CASA DO PONTAL ______ نائی' دھوبی' کوچوان' کسان کے ماڈل نظر آ رہے تھے۔ ایک گیلری کی طرف میری نگاہیں اٹک کر رہ گئی تھیں۔ فال نکالنے والا طوطا اور پاس ہی ایک شخص بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی وہ سب لوگوں کی طوطے کے ذریعے فال نکالے گا۔ ایک عورت ایک شوکیس میں مجسمے کی صورت میں استری کر رہی تھی۔ ایک اور عورت مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ میں نے بٹن دبایا تو اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں کھل کر دانہ پھینکنے لگی تھیں۔

ایک شوکیس میں ایسا ماڈل رکھا ہوا تھا جو ڈھول کے اوپر اس کا ہاتھ تھا۔ جب بٹن کو دبایا تو اس نے ڈھول بجانا شروع کر دیا تھا۔

ایک شوکیس میں حاملہ عورت کا مجسمہ تھا۔ ایک پیٹ میں بچہ دوسرے سر پر گھڑا رکھا ہوا تھا۔ یہ بتانے کی کوشش کی ہوئی تھی کہ عورتیں کتنی مشکل زندگی گزارتی تھیں۔ کہیں اونٹوں کے اوپر سواری کرتے ہوئے مجسموں کو شوکیسوں میں بند کیا ہوا تھا۔

ایک اور جگہ پر سرکس کا سین دکھایا ہوا تھا۔ کہیں کہیں جہازوں کے ماڈل اور کشتیوں کے ماڈل نظر آ رہے تھے۔

اوپر کی گیلریوں میں رکھی ہوئی چیزیں بھی لاجواب تھیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب ہوتے ہوئے دکھایا ہوا تھا۔ اور ایک جگہ لوگوں کو سر قلم کرنے کا سین بھی دکھایا ہوا تھا کہ اس زمانے میں کس طرح مظلوم لوگوں کا سر قلم کرتے تھے۔ یا کسی مجرم کو سزا کس طرح دی جاتی تھی۔ میں حیرانگی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ لڑائی کا سین بھی دیکھنے کو ملا تھا۔ ایک گیلری میں بڑا سا بت درمیان میں کھڑا تھا۔ پرتگالی میں لکھا تھا Sao Jorge- تمام گیلریوں کی کھڑکیوں سے سبزہ نظر آ رہا تھا۔ ہر کوئی ان چیزوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ کافی لوگ وہاں پر مووی بنا رہے تھے۔ اور کئی لوگوں کے ہاتھ میں کیمرے تھے۔ وہ تصویریں لینے میں مصروف تھے۔

فوٹو گرافر لڑکا اور اس کی محبوبہ ہر شخص کی تصویر لینے میں مصروف تھے تاکہ ان کو تصویر دکھا کر روپے وصول کر سکیں۔ وہ دونوں اسی داؤ پر تھے کہ زیادہ سے زیادہ ان کی تصویریں کھینچ سکیں۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔

مگر ان سب میں کسی کو بھی واپس جانے کی اتنی جلدی نہیں تھی۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ وقت دیا جائے تاکہ ان چیزوں کو بغور دیکھ سکیں اور تصویر کھینچ لیں۔

میں نے بھی کافی تصویریں کھینچی تھیں۔

کرسٹینا اور اس کی سہیلی بھی میرے قریب آ گئی تھیں۔ اس کی سہیلی میرے لباس کی تعریف کر رہی تھی۔

کرسٹینا نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ لیڈا کے گھر جائیں گی؟''

''ان کے گھر؟''

''ان کے گھر بہت بڑا باغ ہے۔ وہی سوپولو کی طرف جو سڑک جاتی ہے' وہیں پر ان کا گھر ہے۔ اس نے میری سہیلیوں کو اپنے گھر مدعو کیا ہے۔ کافی مندوبین خواتین جا رہی ہیں۔ کیا آپ چلیں گی ہمارے ہمراہ؟''

''ضرور''

میرے منہ سے ایک دم نکل گیا تھا۔ کیونکہ شہر کا ایک حصہ تو دیکھ چکی تھی مگر ادھر کے لوگوں کے گھروں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا

تھا۔ بے خیالی میں حامی بھر لی تھی۔

میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ بڑی ہی سمارٹ اور عمدہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بھورے بال شانوں پر لہرا رہے تھے اور اس کے مزاج میں ایک خاص قسم کی نزاکت تھی جو باقی لوگوں کی نسبت منفرد تھی۔

وعدہ کر کے یہ بھی نہ سوچا کہ اپنے شوہر سے تو پوچھا ہی نہیں ہے۔ جونہی میں نے اپنے میاں سے پوچھا تو انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ میں نے کرسٹینا کو کہا۔ "تم نے جانے سے پہلے مجھے بتا دینا ہے۔"

"ہم ابھی سے طے کر لیتے ہیں۔ پرسوں شیرٹن ہوٹل میں کانفرنس کا آخری دن ہے۔ دوپہر کے بعد کانفرنس ختم ہوتے ہی ہم ان کے گھر ضرور جائیں گے۔"

کرسٹینا کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے میں نے حامی بھر لی تھی۔

عجائب گھر کو دیکھ کر سب لوگ خوشی خوشی بسوں میں بیٹھ گئے تھے اور بس اسی راستے پر ہوتی ہوئی واپس جا رہی تھی۔ راستے میں جو مسافر جس جگہ اترنا چاہتا تھا بس رک جاتی اور وہ اتر جاتا تھا۔ اسی طرح کوپا کبانہ سے جب بس گزری تو ہم بھی اتر پڑے اور تھوڑے فاصلے پر ہوٹل تھا۔ پیدل ہوٹل کی جانب چل پڑے تھے۔ مزے مزے سے چلے جا رہے تھے۔ آج کی سیر سے لطف دوبالا ہوا گیا تھا۔ برازیل کا خوبصورت عجائب گھر جو دیکھ لیا تھا۔

جیولری ہی جیولری

کوپا کبانہ ایک فیشن ایبل علاقہ تھا۔ ہوٹل سے نکل کر ہم فٹ پاتھ پر پیدل چل رہے تھے۔ کالے اور سفید پتھروں کا فٹ پاتھ سانولے سلونے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس علاقے میں بہت چہل پہل تھی۔ فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ ہوٹل اور دکانیں تھیں۔

کئی دکانوں کے آگے سے گزرے۔ شوکیس میں رکھی ہوئے چیزوں کی ونڈو شاپنگ کی۔ ملبوسات کی دکانیں' جوتوں کی دکانیں' کئی بڑے بڑے سٹور گزرے مگر ہم لوگ چلتے گئے۔ ابھی چند قدم ایک سٹور کو کراس کر کے گزرے تھے کہ ایک زیورات کی دکان کے باہر ایک لڑکی سفید بلاؤز اور کالی سکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے اصرار کرنے لگی کہ دکان کے اندر تشریف لے آئیں۔

میں نے اپنے میاں کی جانب دیکھا خیال تو یہ تھا کہ پیدل چلتے ہوئے ساحل سمندر تک جائیں مگر اس لڑکی کی آنکھوں میں چمک اور التجا دیکھ کر ہم دکان کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ ابھی دکان کا دروازہ پوری طرح بند بھی نہیں ہوا تھا کہ تمام سٹاف اٹھ کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ ہماری آؤ بھگت میں لگ گئے تھے۔

''آپ جیولری تسلی سے دیکھیں اور اس کے بعد ہمیں آرڈر کریں۔''

میں نے حیرانگی سے جیولری کے کاؤنٹر پر کھڑی خاتون کو دیکھا جو کہ نہایت ہی سمارٹ تھی۔ پرل کی جیولری پہنے ہوئے تھی کوئی پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ شوکیسوں میں ہیرے اور جواہرات جگمگا رہے تھے۔ بہت خوبصورت جیولری تھی۔ میں شوکیس کے اندر جھانک کر زیورات دیکھ رہی تھی۔

تو وہ لڑکی جو کہ باہر کھڑی تھی اندر آتے ہوئے کہنے لگی۔

''آپ مزید کچھ دیکھنا چاہتی ہیں تو آپ کو ہم اپنی فیکٹری میں بھیج دیتے ہیں۔ فکر نہ کریں' گاڑی کا پورا بندوبست ہے جو فیکٹری میں لے جائے گی اور واپس آپ کو جہاں چاہیں گے چھوڑ کر بھی آئے گی۔ یہ جیولری تو کچھ بھی نہیں ہے مگر وہاں پر جا کر دیکھئے گا کتنی زیادہ ورائٹی ہے۔''

سب دکان والے ایک قسم سے مجبور کرنے لگے کہ ان کی فیکٹری میں جایا جائے۔ میں لاجواب ہو گئی تھی۔

گاڑی دروازے پر آن کر کھڑی ہو گئی تھی اور بڑے ادب کے ساتھ اس لڑکی نے ہمیں گاڑی میں بٹھایا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر گاڑی شہر کے ہنگاموں کو چیرتی ہوئی فیکٹری پہنچ چکی تھی۔

کار سے اترے ہی تھے کہ استقبال کرنے والے عملے نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ وہ بھی خوش خوش ہمیں اوپر لے گئے تھے جیسے ہم نے لاکھوں کروڑوں کی جیولری خرید لی تھی۔

ایک بڑے سے ہال میں گئے تو شوکیسوں میں بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ سبز پتھر جس کے نیچے ایمرل لکھا تھا' زمرد' فیروزے کے بڑے بڑے پتھر۔۔۔۔۔۔ کچھ پتھر اتنے بڑے تھے جو کہ باہر بغیر شوکیسوں کے سجائے ہوئے تھے اور ہر جگہ پر پتھر کے قریب ایک چھوٹی سی تختی لکھی ہوئے ملتی تھی کہ ''ہاتھ نہ لگائیں'' صاف ستھرا ہال بتیوں اور برقی روشنیوں سے منور تھا۔ ان پتھروں کو دیکھنے کے بعد ایک مصنوعی سیٹ کی طرف آئے جہاں پر پتھروں کی غار کو بنایا ہوا تھا اور اس میں آدمی کان کے اندر' پتھر نکالنے میں مصروف دکھایا ہوا تھا اور غار کے آس پاس بے شمار قیمتی پتھروں کو رکھا ہوا تھا۔ یہ سیٹ ہال کہ ایک کونے میں چند سیڑھیاں چڑھ کر آتا تھا۔

سفید رنگ کے پتھر کے قریب لکھا ہوا تھا۔

Sugar Loat Rock Crystal

فیروزی رنگ کے پتھر پر لکھا تھا' اکوامیرین Aquamrine

نسواری رنگ کے پتھر پر "گارنٹ" لکھا ہوا تھا۔

دکان یا شوروم سمجھ لیں کہ اس کے اندر تو پتھروں کی ایک دنیا آباد تھی۔ دوسری گیلری کی طرف آئے تو وہاں پر جیولری ان پتھروں سے تیار ملی۔ اتنی نازک اور اتنی خوبصورت کہ ان کو دیکھ کر طبیعت مچل اٹھی۔ مگر ہمارے ملک کی نسبت یہ جیولری انتہائی مہنگی تھی۔

برازیل کو قدرت نے معدنی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ جہاں پر زمرد ٹوپاس اور اکوامیرین اور ساؤتھ افریقہ کے بعد کانیں بھی ملیں گی۔ آپ شہر کے ہوٹل شاپنگ پلازہ میں جائیں تو جیولری کے اشتہارات ملیں گے۔ ریوڈی جنیر و میں سٹرن اینڈ کمپنی اور ایمسٹرڈیم کمپنی کا شوکیس ضرور ملے گا۔ ان دونوں جوہریوں کے بے شمار شوروم کو پاکبانہ کے فیشن ایبل علاقے میں یہ ضرور ملیں گے۔ یہ چیزیں بکنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ آپ کو کہا جائے گا گاڑی تیار ہے ہماری ورکشاپ پر چلیں۔ ورکشاپ کے باہر سکیورٹی کا نظام بھی کھڑا ملے گا۔ مختلف راہداریوں میں آپ کو شیشے کے کاریگر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کسی شیشے کے پیچھے رگڑائی ہو رہی ہے اور کسی کے پیچھے کٹائی ہو رہی ہے۔ ہاتھ کا باریک سے باریک کام انہیں کرتے ہوئے دکھایا ہوا ہے۔ اور کسی شیشے کے پیچھے آپ کو جیولری پالش کرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ اور آخر میں زیورات کی تیاری اور یہ قیمتی پتھر جیولری میں جڑے دکھاتے ہیں۔

ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد ہمیں ایک اور ہال میں لے گئے تھے جہاں پر جیولری کے بے شمار کاؤنٹر تھے۔ وہاں کے نگران ہمیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہر طرح کے پتھروں کی جیولری ہیرے' زمرد' ٹوپاس میں بنی نظر آتی ہے۔ یہاں پر آپ پسند کر کے آرڈر دے سکتے ہیں۔

جیولری ابھی میں دیکھ ہی رہی تھی کہ اس فیکٹری کے منیجر نے اپنے کمرے میں ہمیں بلوا لیا تھا۔ برازیلین کافی سے تواضع کی اور مختلف ڈبے جیولری کے منگوانے شروع کر دیئے تھے۔ ہر ڈبے میں ہاتھ کے کام کی نازک جیولری تھی۔ کسی ڈبے میں انگوٹھیاں تھیں اور کسی میں ٹاپس رکھے ہوئے تھے۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی کچھ لینا تو ہے نہیں اور خواہ مخواہ ان کا وقت ضائع کر رہی ہوں۔ مگر وہ بار بار منیجر ہم سے کہہ رہا تھا۔

ہم نے آپ کا بہت وقت ضائع کروایا ہے۔ آپ اس فیکٹری میں آ ہی گئے ہیں تو ٹھیک سے ہر چیز کو دیکھیں۔ منیجر کو اس بات کی

خوشی ہو رہی تھی کہ ہم پاکستانی ہیں۔ کیونکہ کسی زمانے میں پاکستان کی ایمبیسی میں وہ ملازمت کر چکا تھا۔ اسی ناطے پر وہ خوبصورت باتیں کر کے ہمیں پوری طرح سے راغب کر رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی شے خرید لیں۔ مگر ان لوگوں کو کیا معلوم کہ یہ زیورات ہماری دسترس سے باہر تھے۔ دیکھنے کو بھلے بھی لگ رہے تھے۔ مگر خریدنا مشکل تھا۔ خیر اس وقت ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم کچھ نہیں خریدیں گے۔

برازیل میں اگر غربت ہے تو امارت بھی بے شمار ہے۔ وہاں اس فیکٹری میں برازیلین عورتوں اور مردوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ سلم سمارٹ خواتین اچھی پوشاک میں۔ جیولری خریدنے میں مصروف تھیں۔ ان کی چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ میں نفاست تھی۔ سنبھل سنبھل کر بات چیت کر رہی تھیں۔ زیورات خرید بھی رہی تھیں اور اسی قسم کے زیورات انہوں نے پہن بھی رکھے تھے۔ یہ وہاں کی امیر عورتیں تھیں۔

کرسٹینا اور اس کی ساتھی لڑکی لیڈا بھی آ گئی تھی۔ لیڈا کی ماں کی طرف سے اس دن کی دعوت تھی۔ لیڈا نے اپنی ماں سے میرا تعارف کروایا تو میں یہ سن کر حیران ہو گئی تھی کہ وہ ایک نوجوان لڑکی کی ماں ہے۔ وہ تو خود میں اسے لڑکی سمجھے ہوئے تھی۔ دور سے مجھے شوکیس پر جھکے بڑی سمارٹ لگی تھی اور دل ہی دل میں میں نے سراہا تھا کہ یہاں کی عورتوں سے مختلف ہے۔ واقعی ہی میرا قیافہ درست نکلا۔ وہ امراء میں سے ایک تھی۔

بات چیت کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ کیتھرین شاید نام تھا اس کا۔ اس میں خاص تمکنت اور ٹھہراؤ تھا۔ کیتھرین کا میرا لباس بہت پسند آیا تھا اور اس نے مجھے خاص کہا۔

''آپ نے ہمارے گھر ضرور آنا ہے۔''

''جی میں ضرور آؤں گی۔''

''جیولری پسند آئی آپ کو۔''

''بہت پسند آئی ہے۔''

''کچھ خریدا ہے۔''

پسند کرنے کے بعد کچھ فیصلہ کر سکوں گی کہ کیا خریدنا ہے۔ کیتھرین کے ہاتھ میں دو ڈبے تھے جس میں اس نے اپنی بیٹی اور اپنے لیے زیورات خریدے تھے۔ لیڈا نے کھول کر دیکھا تو اچھل پڑی۔ پرتگالی میں ماں کا شکریہ ادا کرنے لگی تھی۔

ہیروں کا جگمگاتا سیٹ جو کیتھرین ایک ماہ پہلے آرڈر دے گئی تھی بن کر تیار ہو چکا تھا۔ لیڈا خوشی کے مارے پھولی نہیں سما رہی

تھی۔کیتھرین نے ٹوپاس کا سیٹ اپنے لیے آرڈر کیا تھا جو کہ نہایت ہی قیمتی تھا۔ٹوپاس کے ساتھ ساتھ اس میں ڈائمنڈ لگے ہوئے تھے۔جی کر رہا تھا کہ اس دکان پر کھڑے ہی رہیں۔اور جیولری دیکھتے رہیں مگر میاں کی آواز نے چونکا دیا۔

''لینا تو کچھ بھی نہیں ہے میرے خیال سے چلتے ہیں۔''

برقی قمقموں سے وہ ہال بقعہ نور بنا ہوا تھا اور چمکتے ہوئے زیورات اپنی طرف کھینچ رہے تھے مگر جانا ضروری تھا۔

نیچے آئے ہی تھے کہ گاڑی پہلے سے ہی تیار تھی۔گاڑی میں بیٹھتے ہی اسے ساحل سمندر کی طرف جانے کے لیے کہا۔کوپا کبانہ ساحل سے چند قدموں پر تھا۔سوچا تھا سمندر کی سیر کرنے کے بعد ہوٹل چلے جائیں گے۔گاڑی نے سیدھا ساحل سمندر کے سامنے دکانوں کے قریب روک دیا۔ابھی گاڑی سے اترے ہی تھے کہ سٹرن جیولری کی دکان کے باہر ایک لڑکے نے روک لیا۔

''پلیز اندر آئیے۔'' اس نے انگریزی زبان میں کہا۔ابھی تو ایمسٹرڈیم شوروم سے بچ بچا کر آئے تھے کہ سٹرن کی جیولری دکھانے کے لیے اس لڑکے نے منتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔

لہٰذا اس دکان کے اندر داخل ہوئے تو مختلف شوکیسوں میں سٹرن جیولری اپنی بہار آپ دکھا رہی تھی۔

ایک پر کشش سمارٹ عورت میرے قریب آئی اور کہنے لگی۔''اگر چاہیں تو ہماری فیکٹری میں جا کر تسلی سے جیولری دیکھ سکتی ہیں۔''

''فیکٹری سے تو ابھی ہم آئے ہیں۔''

میرے شوہر نے مجھے کہا۔''وہ ایمسٹرڈیم کی جیولری تھی' یہ سٹرن کی جیولری کے بارے میں بتا رہی ہے۔''

میں نے جواب دیا۔''آج تو آپ کی دکان کی جیولری دیکھ لیتے ہیں' پھر کسی دن آپ کے شوروم میں چلے جائیں گے۔''

یہ جواب دیتے ہوئے میں جیولری دیکھ کر باہر نکل گئی۔برازیل میں لوگوں کو باقاعدہ پھانسا جاتا ہے۔خوب تواضع کرتے ہیں تاکہ وہ جیولری دیکھ سکیں۔غریب ملک میں اتنی مہنگی جیولری تیار کر رہے ہیں۔انہیں کیا خبر جو سیاح ان کو نظر آ رہے ہیں وہ بھی کسی غریب ملک کے ہی ہیں جو دیکھ تو سکتے ہیں' خرید نہیں سکتے۔

ساحل سمندر کی آزادیاں

ساحل کے کنارے حسب معمول لوگ تیراکی میں مصروف تھے۔مچھلیاں اور ناریل کا جوس پی رہے تھے۔موسم میں خنکی آ گئی تھی۔شام کا وقت تھا' آسمان پر قوس وقزح کے کئی رنگ بکھرے تھے۔فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے' جو ساحل کے ساتھ ساتھ میلوں لمبا تھا۔ایک عورت قریب سے گزری اس کی دھوتی ہوا میں اڑ رہی تھی۔ننگے پاؤں تھی اور بکنی شاید سمندر کی لہروں کی نذر ہو گئی تھی۔

میری نگاہیں اس کے چہرے پر پڑی تو وہ بے نیازی سے چل رہی تھی۔ میرا جی کیا کہ اپنی آنکھیں بند کر لوں' مگر اس ہجوم کی طرف میری نگاہیں اٹک سی گئیں۔۔۔۔۔۔سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ریڑھی والے آوازیں لگا رہے تھے۔ ناریل پلانے اور پینے والے مصروف تھے۔ ساحل کے قریب ستا برگر کا ریسٹورنٹ تھا۔ ساحل کے قریب کرسیوں پر بیٹھے کافی کے ساتھ برگر کھا رہے تھے۔ سب کھانے میں مصروف تھے۔ لوگ پتھروں کی چیزیں اور ٹی شرٹ جو ایک ریڑھی پر لگی ہوئی تھیں خریدنے اور دیکھنے میں مصروف تھے۔ کسی کو اس کی بکنی اترنے کا خیال نہیں تھا۔ وہ عورت خود بھی جیسے بکنی اتارنے کی عادی تھی۔

''خدایا! یہ کون سی مخلوق ہے۔'' ابھی میں نے یہی سوچا تھا کہ اس کا جواب مجھے خود ہی مل گیا تھا۔ بکنی اگر اتر گئی ہے تو لوگوں میں بے نیازی بھی تو ہے۔ شاید اسی لیے اتارنے والی بے نیاز ہیں۔

ریوڈی جنیرو کی خوبصورتی سمندر اور پہاڑ ہیں۔ ساحل سمندر پر آئیں تو لگتا ہے' دنیا یہیں پر آباد ہے۔ اور جواہرات کے شوروم میں جا کر دیکھا تو لگتا تھا تمام کی تمام دنیا یہی پر سمٹ کر آ گئی ہو۔ ذرا آگے آئے تو ایک کھوکھے پر کچھ لڑکے کھڑے بیئر کے ٹن کھول کر پی رہے تھے۔ ان کے قریب ہی کرسیوں پر چند لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ بیئر ان کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ شاید وہ لڑکیاں ان لڑکوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ سانولی سلونی لڑکیاں' پرکشش ضرور تھیں مگر ان کو بہت خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ناریل کے درخت' پام اور اناس کے درختوں کے جھنڈ میں کچھ لڑکے اور لڑکیاں فٹ پاتھ کے کنارے بنچ پر بیٹھے تھے۔ ویک اینڈ تھا۔ بقول کرسٹینا کے اور لیلا کے لڑکے اور لڑکیاں سالوں ڈیٹ پر جاتی ہیں اور پھر کہیں جا کر شادی کرتی ہیں۔ آج کی سیر میں اس نوجوان طبقے کو آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

تھوڑی سی دیر گزری تھی کہ وہ لڑکے اور لڑکیاں وہاں سے چلے گئے تھے۔ شاید کسی کا انتظار تھا۔ اس کے آتے ہی کسی ریستوران کی جانب چل پڑے تھے۔ امریکہ میں اتنی بے حیائی نہیں دیکھی تھی مگر چلتی سڑک پر ریستوران پر' شاپنگ پلازہ پر لڑکے اور لڑکی کو دنیا ومافیہا سے بے نیاز راز ومحبت کی باتیں اور لپٹتے دیکھا تھا جسے وہاں کے لوگ اس چیز کے عادی تھے۔ یہ اس قسم کی حرکات ہمارے لیے نئی تھیں۔

بس سٹاپ کے قریب سے گزرے تو لیلا کھڑی تھی۔

''ہائے'' اس نے پکارا۔

''ارے تم یہاں کھڑی ہو؟''

''کل کانفرنس کا آخری دن ہے۔ میں نے پرسوں بریڈیلہ چلے جانا ہے۔ میرا ساتھی لڑکا آ رہا ہے' اس کا انتظار ہے۔ آج ڈنر ہم نے میرینہ ہوٹل میں کرنا ہے۔''

''اچھا تو تم پرسوں چلی جاؤ گی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں تو اپنی بکنگ کروا کر آئی تھی۔''

''آپ لوگ کب واپس جائیں گے؟''

''ہم تین روز بعد جائیں گے۔ واپسی پر لندن جانا چاہتے ہیں۔ میرا ویزہ نہیں لگا ہوا ہے۔''

''اور ان کا۔۔۔۔۔۔؟'' اس نے ریاض کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ان کا لگا ہوا ہے۔ اگر ویزہ لگ گیا تو لندن ضرور جاؤں گی' ورنہ سیدھا پاکستان جانے کا ارادہ ہے۔''

''مجھے ایک دم سے یاد آ گیا تھا کہ لیلا نے اسے بتایا تھا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی' اس لیے کہ خواہ مخواہ کی پابندی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔''

میں نے اسے ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

''گھر پہنچ کر اپنا گھر بسانے کا سوچنا۔''

''گھر تو کب کا بسا چکی ہوتی' مگر میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ اب دیکھئے نا کہ اس طرح آزادی سے میں گھوم پھر نہیں سکتی۔''

''صرف پھرنا ہی زندگی تو نہیں ہے۔''

''اور شادی بھی کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے۔'' لیلا مسکرا رہی تھی۔

کچھ ہی دنوں میں لیلا اپنے دل کی باتیں مجھ سے کرنے لگی تھی۔ ساحل کی لہریں تیز ہو گئی تھیں۔ شاید تیز ہوا چل رہی تھی۔

سرخ لباس میں لیلا بڑی پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ آزاد رہنا چاہتی تھی۔ میں اس کو نصیحتیں کر رہی تھی جو وہ سن کر ٹال دیتی تھی۔ زندگی کے چھتیس سال گزار چکی تھی۔ مزید زندگی بھی اسی طرح گزارنا چاہتی تھی۔

میرے میاں نے سرگوشی کے انداز میں اردو میں کہا۔

''اس کی مرضی ہے تم خواہ مخواہ اس کو شادی کے بندھن میں باندھنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔۔۔ یہ پاکستان تھوڑی ہے۔ یہ برازیل ہے۔''

وہ مسکرا کر پوچھنے لگی۔ "کیا بات کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔کاش میں آپ کی زبان سمجھ سکتی۔"

میں نے اس کو جواب دیا۔ "زبان جاننے کے بعد نہ صرف میری باتیں سمجھ آتیں بلکہ میری نصیحت پر بھی عمل کرتی۔"

وہ ہنس پڑی۔ اس کے خوبصورت دانت ہنسنے سے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کا ساتھی لڑکا ٹیکسی پر آیا اور اس کے قریب سڑک کے کنارے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"او جیکی تم آ گئے ہو۔"

میں نے غور سے جیکی کو دیکھا تو وہ چوبیس پچیس سال کا ہو گا۔ اس نے ہم سے بھی خندہ پیشانی سے علیک سلیک کی اور لیلا کو لے کر سڑک پار مرینہ ہوٹل میں داخل ہو گیا تھا۔ میں حیرت سے ان کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"لڑکا تو بہت چھوٹی عمر کا دکھائی دے رہا ہے۔"

ریاض مسکرائے۔

"تم سامنے شفق کو دیکھو۔ سمندر پر اس کا عکس کتنا بھلا لگ رہا ہے۔ یہ چیز یہاں کی تہذیب کا حصہ ہے۔ فضول باتوں سے اپنا دماغ خرچ نہ کرو۔"

میں نے سمندر کی جانب دیکھا تو شام کے دھندلکوں میں شفق کا عکس سمندر پر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ یہ چیز واقعی ہی ان کے کلچر کا حصہ تھی۔ میں وہاں کی خوب صورتی میں کھو گئی تھی۔ تھوڑی دور سامنے بھٹوں کی ریڑھی دکھائی دی۔

ریاض نے بھٹہ لیا۔ نمک اور لیموں لگا بھٹہ بالکل پاکستان کی طرح اس کا ذائقہ تھا۔ ناریل کی ریڑھی سے ناریل کا جوس پیا۔ دونوں چیزیں کھا اور پی لی تھیں۔

زبان کی بے زبانیاں

جب سے آئے تھے زبان کا مسئلہ آڑے آ رہا تھا۔ سوائے بڑے ہوٹلوں یا چند لوگ جو کانفرنس میں آئے تھے کوئی بھی انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اس وقت کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ سوچا تھا کہ آج ہوٹل میں کھانا نہیں کھائیں گے کسی ریستوران میں چلتے ہیں۔ مگر وہی مسئلہ تھا۔

ریاض نے مجھے کہا۔

"ہوٹل کے قریب ایک چھوٹا سا ریستوران میں نے دیکھا تھا۔ باربی کیو لگتا ہے وہاں چلتے ہیں۔ اپنے ہوٹل جانے میں آسانی ہو

گی۔"

میں نے حامی بھردی اور گراٹو ریستوران کی طرف چل پڑے۔راستے میں فٹ پاتھوں پر کافی ریڑھیاں نظر آئیں۔ ہر طرح کی چیزیں عورتیں بیچ رہی تھیں' جو زیادہ قیمت بتا کرستے داموں میں بھی بیچ دیتی تھیں۔شام ڈھل گئی تھی اور تاریکی پھیل چکی تھی۔ چاروں طرف روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔

رات کے وقت ریو میں ہر کسی کو گھر جانے کی جلدی تھی۔شاید یہاں کی وارداتوں کی وجہ سے لوگ گھروں کو لوٹ جانا چاہتے تھے۔ریستوران کے راستے پر ایک فقیر باجا بجا رہا تھا۔اس کی دھن اتنی اداس تھی کہ چند لمحوں کے لیے میں اداس ہو گئے تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اس دھن کو سنا جائے مگر ریاض نے تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہاں پر کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

"مگر یہ باجا بہت اچھا بجاتا ہے۔"

"کہانا یہ علاقہ ٹھیک نہیں ہے۔"

چاروناچار مجھے آگے بڑھنا پڑا۔ریستوران آچکا تھا اس کے اندر داخل ہوتے ہی میں حیران ہو گئی تھی۔ بہت بڑے کمرے کے درمیان بڑی سی کوئلوں کی انگیٹھی جل رہی تھی اور انگیٹھی کے چاروں طرف کاؤنٹر لگے تھے۔اور کاؤنٹر پر بہت سے لوگ باربی کیو قسم کا کھانا کھا رہے تھے۔ہم بھی ان کے قریب ایک کاؤنٹر پر بیٹھ گئے تھے۔لیموں' سلاد اور زیتون کے تیل کا ڈبہ ہمارے سامنے رکھا گیا تھا۔

اس شخص نے پرتگالی میں پوچھا۔

"کیا کھائیں گے؟"

"یو سپیک انگلش؟"

"نو" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

میں نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی خاتون سے پوچھا کہ تمہیں انگریزی آتی ہے تو وہ مسکرا پڑی اور کچھ جواب نہ دیا۔

"یا اللہ کہاں آ گئے ہیں؟"

"صبر کرو۔۔۔۔۔۔۔ابھی اس کو میں پوچھتا ہوں کہ کیا کیا اس کے پاس ہے۔"

وہ ویٹر سمجھ گیا کہ ہمیں زبان کا مسئلہ آڑے آ رہا ہے تو اندر جا کر ایک اور ویٹر کو لے آیا تھا۔ جس کو دو یا چار لفظ انگریزی کے آتے تھے۔

ریاض نے اس سے کہا۔ ”وی وانٹ فش“

”فش“ وہ مسکرایا اور کچن میں چلا گیا تھا۔

”وہ تو چلا گیا ہے۔“ میں نے ریاض سے کہا۔

اس وقت پیدل چلنے پھرنے سے کافی بھوک لگ رہی تھی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ وہ کچی مچھلی لے آیا تھا اور اشاروں سے سمجھاتے ہوئے پوچھنے لگا کہ یہ چیز کھانی ہے۔

ہم نے ایک دم سے اپنا سر ہلایا تو اس نے مسکراتے ہوئے مچھلی کو مصالحہ لگایا اور گرل پر رکھ دیا۔ اور گرل کے اوپر بن کر گرم کیا۔ ایک چھوٹی سی ٹوکری میں ان کو رکھا اور ہمارے کاؤنٹر پر رکھ دیا تھا۔ لوگ بن کے اوپر زیتون کا تیل لگا لگا کر کھا رہے تھے۔ چکن اور بیف کی بھری پلیٹیں ان کے سامنے تھیں۔ سلاد بھی کھا رہے تھے اور سامنے بھری پلیٹوں کو بھی صاف کر رہے تھے۔ ان کو اتنا زیادہ گوشت کھاتے دیکھ کر حیرانگی ہو رہی تھی۔

ہمارا کھانا ابھی تیار نہیں ہوا تھا کہ ایک غریب بوڑھا جو ریستوران کے باہر دروازے کے ساتھ لگا ہوا تھا' میں نے ویٹر کو بلایا اور اس کو اشارے سے سمجھایا کہ اس کو کھانا دے دو اس کا بل ہم ادا کریں گے۔

ویٹر نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا تو مجھے پھر کہنا پڑا کیونکہ اس وقت مجھے شدید بھوک لگی ہوئی تھی اور کسی بھوکے پیٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ دوبارہ جب ویٹر کو کہا تو اس نے جواب دیا۔

”ہم اس کو کھانا دے دیتے ہیں وہ ایسے کھانا نہیں لے گا' کیونکہ وہ یہاں پر کام کرتا ہے۔“

اس نے کام کرنے کی بات بھی اشاروں سے سمجھائی تھی۔ میں اس بوڑھے کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی' وہ اس قدر بوڑھا تھا اگر بھیک بھی مانگ لیتا تو مستحق تھا۔ ایک اپنے ملک میں ہٹے کٹے لوگ بھیک مانگتے ہوئے یاد آ گئے تھے' جو کام نہیں کرتے بلکہ بھیک مانگنے کی انہیں عادت پڑ چکی ہے۔ خاص کر کے جوان عورتیں' لڑکیاں بجائے کام کرنے کے مفت میں روپے بٹورتی ہیں۔

تھوڑی دیر میں کھانا تیار ہو کر ہمارے کاؤنٹر پر رکھا گیا تھا۔ جو بہت ہی عمدہ تھا۔ اس کا ذائقہ ہمارے کھانے سے بہت ہی مختلف تھا۔ ہم نے بڑی رغبت سے کھانا کھایا تھا۔

باہر ریستوران سے نکلے تو بوڑھے نے میرے چاندی کے کڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے اشاروں سے سمجھایا کہ اسے پہن کر نہ نکلا کرو۔ آتے جاتے لٹیرے لوٹ لیتے ہیں۔

میں نے جلدی سے اپنا دوپٹہ کڑوں کے اوپر لپیٹ لیا۔ اور تیز تیز چلتے ہوئے ہوٹل پہنچ گئے تھے۔



باب سوم

کانفرنس کا اختتام

کانفرنس کا آج آخری دن تھا۔ ہال میں سیشن چل رہا تھا۔ مختلف چھوٹے چھوٹے کیبن میں ٹرانسلیٹر خواتین بیٹھی تھیں۔ سٹیج پر صدارت کرنے والے حضرات اور ایک خاتون بیٹھی تھی۔ فوٹو ئیں مسلسل اتاری جارہی تھیں۔ ہر کوئی اس سیشن میں موجود تھا۔ آج کے بعد ہر کسی نے اپنے اپنے ملک سدھار جانا تھا۔ مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف مائیک پر کھڑے شخص کی ہال میں آواز گونج رہی تھی جو بھر پور طریقے سے اپنے دلائل پیش کر رہا تھا۔ اگلی نشستوں میں ہم لوگ بھی بیٹھے تھے۔ اس کانفرنس میں میرے شوہر ریاض نے پورا پورا حصہ لیا تھا۔ کئی ایسے نکتے تھے جن پر انہوں نے روشنی ڈالی تھی۔ مجھے اس وقت یہ خوشی ہو رہی تھی' چلو پاکستان کی طرف سے کسی نے تو دلائل دیے۔ ورنہ باہر کے ملکوں میں پاکستان کو بہت کمتر سمجھا جاتا ہے۔

کانفرنس کا اختتام ہو چکا تھا۔ اسٹیج پر بیٹھی خاتون نیچے اتری اور خندہ پیشانی سے ہمیں مل رہی تھی۔ جان پہچان تو چند روز پہلے ہی ہو گئی تھی مگر آج وہ مجھ سے گلے ملتے ہوئے بتا رہی تھی۔

''تمہارے ملک کراچی کے شہر میں میری بیٹی رہتی ہے اور اس کا شوہر وہاں پر ملازمت کرتا ہے۔ مجھے آپ لوگوں کو دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ کاش میں آپ کے ساتھ پاکستان جاؤں اور بیٹی سے مل سکوں۔''

''آپ پاکستان میں آئیں' آپ کے لیے مشکل تو نہیں ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے' اس کی شادی کر چکی ہیں۔''

وہ اپنے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنس کر کہنے لگی۔

''آپ ہی انہیں بتائیں کہ میں کس قدر مصروف ہوں۔''

وہ لیڈی شاید سکاٹ لینڈ سے آئی تھی۔ بڑی عمدہ پوشاک کے علاوہ خوبصورت میچنگ پرل پہنے ہوئے تھے۔

میرے شوہر نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم دونوں ہی بہت مصروف ہیں۔ ایک ہی کمپنی میں دونوں کام کرتے ہیں۔ شام پانچ یا چھ بجے فراغت ہوتی ہے۔ اتنا وقت

ہی نہیں ہے کہ پاکستان جا سکیں۔"

"پاکستان آپ کبھی گئے ہی نہیں؟"

"میں ایک مرتبہ پاکستان گئی تھی۔"

"کون کون سے شہر گئی ہیں؟"

"کراچی اور اسلام آباد جا سکی ہوں۔ باقی کے شہر دیکھنے کا ارمان ہی رہ گیا تھا دل میں۔"

"کیسا لگا پاکستان؟"

"بہت ہی اچھا' خاص کر کے مجھے اسلام آباد بہت ہی اچھا لگا جیسے ہمارے سکاٹ لینڈ کی طرح ہو۔ کوئی فرق نہیں لگا۔ آپ لوگ بہت اچھے اخلاق کے اور مہمان نواز ہیں۔ یہ میں نے وہاں پر خاص نوٹ کیا ہے۔ جب بھی پاکستان آئی میں ضرور آپ کو آ کر ملوں گی۔"

وہ مجھ سے پتہ لینے لگی تھی' جو میں نے بخوبی دے دیا تھا۔

کانفرنس ہال کے باہر آئے تو ہر کوئی ہشاش بشاش ایک دوسرے کو گلے مل رہا تھا۔ ہر کوئی اداس تھا۔ ایسے معلوم ہونے لگا تھا جیسے سب لوگ ایک خاندان کی صورت میں ہوں۔

جیولری کی فیکٹری

لیلا اور کرسٹینا اور ماریہ کہیں جانے کے لیے تیار تھیں۔ شیر ٹین میں جو جیولری کی دکان تھی اس کے سیل مین میں نے خواتین کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ جیولری کی فیکٹری سٹرن اینڈ کمپنی کی طرف سے انہیں مدعو کیا جا رہا تھا۔ سب خواتین مجھے بھی اصرار کرنے لگی تھیں۔ وہاں کی فیکٹری میں نے نہیں دیکھی تھی۔ آٹھ یا دس خواتین کو لے جانے کا بندوبست سیل مین نے کر دیا تھا۔

جب ہم لوگ وین میں بیٹھنے لگے تو سیل مین بھاگتا ہوا میرے قریب آیا اور مسکراتے ہوئے ایک کتاب میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

"آپ شاید جیولری کی کتاب انگریزی میں چاہتی تھیں' یہ کتاب اپنے ملک لے جایئے گا اور تسلی سے وہاں سے آرڈر کیجئے گا۔۔۔۔۔۔ہم ویسے ہی آرڈر کے مطابق آپ کو جیولری تیار کر دیں گے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے وہ کتاب اس سے لے لی اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وین میں بیٹھ گئی تھی۔ سٹرن اینڈ کمپنی کی

فیکٹری بائیں جانب تھی۔ ساحل کے ساتھ ساتھ سڑک رواں دواں تھی۔ خواتین کو جیولری دیکھنے کا تجسس پیدا ہو رہا تھا۔ کیونکہ جیولری دیکھ یا خرید کر وہ لوگ جلد از جلد لوٹنا چاہتی تھیں کیونکہ لیڈا نے سب خواتین کو اپنے گھر پر مدعو کیا ہوا تھا۔

وین سرنگ سے گزری اور کھلی آبادی کی طرف چل پڑی تھی۔ بائیں جانب مڑ کر دو کلومیٹر دور ہی گئی ہو گی کہ سٹرن کی فیکٹری کے قریب رک گئی تھی۔ فیکٹری میں داخل ہی ہوئے تھے کہ کاؤنٹر پر کھڑے شخص نے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک کوپن پکڑاتے ہوئے کہا۔

''جب آپ لوگ فیکٹری دیکھ لیں گے تو لاٹری نکالی جائے گی۔ اس میں نمبر درج ہیں۔ جس کا نمبر نکل آیا اسے انعام ملے گا۔ ہم لوگ وہاں سے کوپن لے کر اوپر آ گئے تھے۔ بڑے بڑے قیمتی پتھر راہداری میں رکھے ہوئے تھے پھر جب بہت بڑے ہال میں داخل ہوئے تو دیوار کے ساتھ ساتھ شیشے کے بہت سارے کیبن نظر آئے۔

ایک کیبن پر میری نظر پڑی تو دو تین آدمی چھوٹے چھوٹے پتھروں کی رگڑائی کر رہے تھے۔ ایمرل' روبی اور فیروزے کے پتھر دکھائی دے رہے تھے۔ ذرا آگے بڑھے تو دوسرے کیبن میں شیشوں کے ذریعے دیکھا تو یہاں پر بھی باریک پتھروں کے ٹکڑے کئے ہوئے تھے۔ ایک مشین لگی ہوئی تھی۔ جس سے بڑے ٹکڑے کے چھوٹے ٹکڑے نکل کر باہر آ رہے تھے۔ اور ایک فرد اس کو سمیٹ رہا تھا اور دوسرے دو شخص اس کو ہاتھوں سے خوبصورت Shape دے رہے تھے۔

تیسرے کیبن میں سونے کی جیولری ہاتھوں سے تیار ہو رہی تھی۔ یہ جیولری نگینوں کے بغیر تھی۔ یہاں پر بھی دو تین لوگ بیٹھے تھے۔ انہیں کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کے آس پاس کوئی اور لوگ بھی موجود ہیں وہ اپنے کام میں مگن دکھائی دے رہے تھے۔

دوسری گیلری میں گئے تو سونے کی چیزوں میں نگینے جڑے جا رہے تھے۔ کسی میں ہیرے' کسی میں ٹوپاس' فیروزی' سبز اور مختلف رنگوں کے نگینے جڑے جا رہے تھے۔

یہ سیکشن تھا جہاں پر زیورات تیار ہو رہے تھے۔ میرے ہمراہ خواتین بڑے غور و خوض کے ساتھ دیکھ رہی تھیں۔ مارگریٹ جس کی لڑکی پاکستان میں بیاہی ہوئی تھی' جو زیورات خریدنے کے لیے بے چین تھی۔

''یہاں کے زیورات اور سٹون تو زمانے بھر میں مشہور ہیں۔'' میں نے مارگریٹ کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مگر یہی زیورات نیویارک میں یہاں کی نسبت کم داموں میں مل جاتے ہیں۔''

کیونکہ ایمسٹرڈیم فیکٹری میں جا کر اور زیورات کی قیمتیں معلوم کر کے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ برازیل میں زیورات مہنگے ہیں۔

مگر مارگریٹ میری بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ کانفرنس سے فارغ ہو چکی تھی' کچھ سٹون اور چند زیورات لینا چاہتی تھی۔

ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے اس جگہ آ گئے تھے جہاں پر زیورات تیار شوکیسوں میں اپنی خوبصورتی کو دوبالا کر رہے تھے۔ ہر کوئی دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کر رہا تھا۔ بے شمار برقی قمقمے جل رہے تھے۔ بتیوں کی روشنی میں زیورات کچھ اور بھی چمک دمک رہے تھے۔ خواتین نے خریداری شروع کر دی تھی۔ بنی سنوری برازیلین خواتین مسکرا مسکرا کر ان کو خریدنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ میں جیولری کے سیکشن سے ہٹ کر ایک طرف گئی تو ایک اور سیکشن تھا جہاں پر ہر قسم کا قیمتی پتھر خوبصورت ڈبوں میں نظر آ رہا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں پر اگر جیولری نہ بھی خریدیں تو وہ پتھر ہی خرید کر اپنے ملک میں لے جا سکتے تھے تاکہ اپنے ملک میں جوہریوں کے ذریعے زیورات میں جڑوا سکتے تھے۔

کئی خواتین نے وہ ڈبے بھی خریدے۔ کاؤنٹروں پر کھڑی عورتیں میرا پاکستانی لباس دیکھ کر بہت محظوظ ہو رہی تھیں۔ خریداری جب ختم ہوئی تو ایک خاتون نے اناؤنس کیا کہ اب لاٹری نکلنے کا وقت آ گیا ہے۔ ہم ایک پاکستانی لیڈی کو بلاتے ہیں وہ ڈبے سے نمبر کی پرچی نکالے۔ اچانک مجھے یہ سن کر حیرت بھی ہوئی۔ خیر میں جیولری کے سیکشن کے کاؤنٹر پر چلی گئی۔

ڈبے میں پرچیوں کو ہلاتے ہلاتے میں نے ایک پرچی نکالی۔ نمبر بولا گیا تو ایک دم سے ایک فرینکفرٹ سے آئی خاتون نے کہا۔

''یہ نمبر میرا ہے۔''

اس کو بلایا گیا تو خوش ہوتے ہوئے کاؤنٹر کے قریب آئی اور اس کے ہاتھ میں قیمتی ٹوپاس کا ڈبہ پکڑاتے ہوئے میں نے اسے مبارکباد دی۔ وہ خاتون بے حد خوش تھی کہ بیٹھے بٹھائے اسے مفت میں سٹون مل گئے تھے۔

لیڈا ہمارے ہمراہ کھڑی تھی۔ کل اس کی ماں نے اس کے لیے جیولری خریدی تھی جو اس وقت اس نے پہن رکھی تھی۔ مگر شوکیس میں کچھ اور زیورات پسند کر رہی تھی۔ سب شوروم والے اس کو جانتے تھے۔ وہ اس کی آؤ بھگت میں لگ گئے تھے۔

جب جانے کے لیے اجازت چاہی تو انہوں نے کہا۔

''آپ کے لیے کافی کا بندوبست کیا ہوا ہے' وہ پی کر جائیں۔''

دوسرے کمرے میں کافی کا انتظام تھا۔ برازیل کی کافی چھوٹے چھوٹے پیالوں میں پیش کی جا رہی تھی۔ یہ اس ملک کی خاص کافی تھی۔ مگر اس قدر کڑوی اور تیز تھی کہ مجھ سے پی نہیں جا رہی تھی۔ مگر ان لوگوں کو شاید عادت تھی اس طرح کی کافی پینے کی کہ انہوں نے دو

دو مرتبہ وہ کافی پی اور شوروم سے نکل کر باہر تک آئیں۔

ایک بار پھر اس فیکٹری سے نکل کر ہم شیرٹین ہوٹل آ گئے تھے۔ لوگوں کو اپنی بیویوں کا انتظار تھا۔ اور ویسے بھی آج یہاں آخری دن تھا۔ سب ایک دوسرے کے پتے نوٹ کر رہے تھے۔

لیلا نے اپنا پتہ مجھ سے لیتے ہوئے کہا۔

''زندگی رہی تو میں ضرور پاکستان آؤں گی۔ مجھے سیاحت کا بہت شوق ہے۔ میں دنیا کا کونہ کونہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

میں نے اس کو بھرپور دعوت دے ڈالی تھی۔ ایک پرتگالی مندوب جو اشاروں سے مجھ سے باتیں کرتی تھی وہ بھی میرے گلے مل کر مجھ سے الوداع ہو رہی تھی۔

شادیاں اور وفائیں

لوگ اپنا اپنا سامان ہوٹل سے لے جا رہے تھے۔ اور کچھ لوگ ایک آدھ دن مزید رہنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ہم بھی تھے۔ ہماری بکنگ بارہ تاریخ کی ہوئی تھی۔ ہمارے جانے میں تین چار روز باقی تھے۔ سوچا تھا برازیل کی بقایا سیر لیں گے اور یہاں کے شاپنگ سنٹر بھی دیکھ لیں گے۔

شیرٹین ہوٹل میں میرے میاں کچھ اور لوگوں کے ساتھ مصروف ہو گئے تھے۔ انہوں نے علیحدہ جگہ چن لی تھی۔ سوئمنگ پول پر وہ بیٹھے گپ لگا رہے تھے۔ اور ہم کیتھرین کے گھر جانے کے لیے تیار تھے۔ لیڈا کی گاڑیاں ہوٹل کے باہر کھڑی تھیں۔ آج عورتوں کا دن تھا اور ہم لیڈا کے گھر جا رہے تھے۔

گاڑیاں شہر کے دوسرے سمت ساحل کے ساتھ ساتھ بھاگی جا رہی تھیں۔ سڑک کے دوسری جانب سرسبز درخت کھڑے تھے۔ ان درختوں کے پیچھے سرسبز پہاڑ تھے۔ موسم اتنا دلفریب تھا آسمان پر بادل امڈتے چلے آ رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ صاف ستھرا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ ایک خوبصورت سرسبز پہاڑی سڑک کے سامنے نظر آ رہی تھی۔ اور اس پہاڑی پر بے شمار خوبصورت گھر نظر آ رہے تھے۔ چار گاڑیاں جن میں صرف خواتین سوار تھیں لیڈا کے گھر داخل ہوئیں۔ ایک لمبی سی بل کھاتی سڑک پر اونچائی میں گاڑیاں چڑھتی گئیں۔ ایک کلومیٹر کا راستہ تو صرف گھر کی انٹرنس تک ہی جاتا تھا۔ پھر ایک خوبصورت باغ جو پھولوں اور پھلوں کے درخت سے ڈھکا ہوا تھا۔ رنگا رنگ کے پھول اور پھل درختوں پر لگے عجب سماں پیدا کر رہے تھے۔ سارے باغ میں چنبیلی کی خوشبو پھیلی تھی۔ پھر گاڑیاں گھر کے دروازے کے اندر داخل ہو گئی تھیں۔ کیتھرین دراصل مارگریٹ کی سہیلی تھی۔ کسی زمانے میں دونوں

کلاس فیلوز تھیں۔ مارگریٹ کے اعزاز میں یہ چائے کا اہتمام ہوا تھا۔کیتھرین نے خاوندوں کو اس لیے نہیں بلایا تھا کہ اس کا اپنا شوہر دوسرے ملک میں بزنس کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔

محل نما گھر کے اندر داخل ہوئے تو سامنے بڑی سی لابی کو پار کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے تھے۔کیتھرین اور لیڈا خواتین کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں اوپر لے کر آ رہی تھیں۔ بے شمار سیڑھیاں تھیں۔ راستے میں دیوار کے ساتھ کیتھرین اس کا شوہر اور لیڈا کی بڑی بڑی تصویریں لگی تھیں۔یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ تصویریں ابھی بول پڑیں گی۔

سب سے اوپر کی منزل پر آتے ہی میری نظر چاروں طرف شیشوں کی کھڑکیوں پر پڑی۔ پردے اس وقت ہٹے ہوئے تھے۔ ساحل اتنا قریب سے نظر آ رہا تھا جیسے اس گھر کا لان ساحل ہو۔تیز ہوا کی وجہ سے موجیں مستانی ہو رہی تھیں لہروں کا اٹھکیلیاں کرنا' ساحل پر آنا اور تیزی سے مڑ جانا ایک خاص قسم کا تاثر پیدا کر رہی تھیں۔سمندر سے نگاہیں ہٹائی تھیں کہ لونگ روم کے فرنیچر کو غور سے دیکھا تو وکٹورین سٹائل کا تھا اور جدید قسم کے کپڑے سے اس کی پوشش ہوئی تھی۔ اعلیٰ اسٹیچوز اور قیمتی کرسٹل کے علاوہ دیواروں پر خوبصورت پینٹنگ جیسے عجائب گھروں میں دیکھ کر آئی تھی' اسی قسم کی پینٹنگ تھی۔ پیسہ منہ سے بول رہا تھا۔تمام خواتین اس گھر کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔میں کھڑکی کی طرف غور سے دیکھنے لگی تھی تو کیتھرین نے مجھ سے کہا۔

''ساحل کا لطف لینا ہے تو لان میں بیٹھتے ہیں۔''

اس نے لانگ روم کا دروازہ کھولا تو دروازے کے ساتھ سرسبز لان جہاں پر رنگارنگ کے پھول لگے ہوئے تھے' پھولوں کی مہک سے عجیب قسم کی تروتازگی کا احساس ہو رہا تھا۔دروازہ کھلتے ہی سب خواتین باہر آ گئی تھیں اور کرسیاں جو پہلے سے ہی وہاں لگائی گئی تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔گھر کے لونگ روم میں اتنی اونچائی پر لان کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔

مارگریٹ اور کیتھرین ایک کونے میں بیٹھی باتوں میں مصروف ہو کر بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر رہی تھیں۔ایک ہی طرح کے خاندان اور ایک ہی سکول کی دو سہیلیاں تھیں۔ایک خوشحال اور دوسری کو خدا نے اتنا نوازا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے امیر ہو گئی تھی۔لیڈا کی ماں کیتھرین خوب صورت بھی بہت تھی اس کے شوہر رالسن کا بزنس شادی کے بعد ایسی چمکی کہ کبھی کبھی اسے خود اعتبار نہیں آتا تھا کہ وہ رئیسوں میں شمار ہونے لگا ہے۔

لیڈا کی پیدائش کے بعد دن دگنی رات چگنی بزنس میں ترقی ہونے لگی تھی۔ کیتھرین کے پاس بے شمار دولت آ چکی تھی مگر وہ اپنی سہیلی مارگریٹ کو ابھی تک نہیں بھولی تھی۔ ساحل پر جب اس نے گھر لیا تھا تو اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ مارگریٹ اس کے پاس

آئے مگر سالوں بیت گئے دونوں ادھیڑ عمر میں پہنچ چکی تھیں۔ جب مارگریٹ کو کانفرنس میں صدارت کرتے دیکھا تو لیڈا نے ماں سے جا کر کہا۔

"ماما! آپ کی سہیلی مارگریٹ سکاٹ لینڈ سے آئی ہیں۔"

"کب آئی ہے؟"

"وہ کانفرنس میں آج صدارت کر رہی تھیں۔" لیڈا نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا تھا مگر پریکٹس ابھی تک نہیں کی تھی۔ کیتھرین کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مارگریٹ بڑے پائے کی وکیل ہے بارہا اس نے سوچا کہ لیڈا کو اس کی شاگردی میں چھوڑ دے مگر اس کا رابطہ کبھی نہیں ہو سکا تھا۔ جس گھر میں مارگریٹ رہتی تھی وہ گھر اس نے تبدیل کر لیا تھا۔ اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اپنا نیا پتہ کیتھرین کو بھجواتی۔ وہ خود وکیل تھی اور اس کا شوہر بھی بیرسٹر تھا۔ دونوں ایک کمپنی کے لیگل ایڈوائزر رہتے۔

میں نے جب ان کے بارے میں سنا تو مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ دونوں اتنی پیاری سی سہیلیاں عمر کے درمیانے حصے میں جا کر ملی ہیں۔ میں نے لیڈا سے پوچھا "لیڈا! تم نے اپنی آنٹی مارگریٹ کو کیسے پہچانا؟"

"مارگریٹ آنٹی کی تصویریں ہماری البم میں لگی ہیں۔"

"تو تم ان تصویروں کو دیکھ کر آنٹی کو پہچان پائی ہو۔"

"جی" لیڈا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیتھرین نے چائے کے لیے ویٹر کو کہا کہ ڈائننگ روم میں چائے کا بندوبست کرے۔ ویٹر بڑے مودب انداز میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ ہم لوگ وہیں پر ابھی بیٹھے تھے کہ ایک نوکرانی چار کتوں کو لٹوں سے پکڑے آئی۔ دو ایک میں اور دو پٹے ایک ہاتھ میں تھے۔ کیتھرین سے کہنے لگی۔

"میڈم ان کا کھانا تیار ہے' کیا ابھی کھلانا ہے ان کو؟"

کیتھرین نے اس سے کہا۔

"خانساماں کو کہو ان کے لیے گوشت اچھی طرح تیار کروائے اور ہاں جو بلیاں ہیں ان کے لیے کتوں کا کھانا نہ ہو بلکہ ان کے لیے علیحدہ کھانا تیار کرواؤ۔" یہ کہتے ہوئے کیتھرین نے سب کو اندر لیجاتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال سے لونگ روم میں چلتے ہیں۔" کیتھرین کے ساتھ سب خواتین اندر داخل ہو گئی تھیں۔ انسانوں کے کھانے کے

ساتھ ساتھ کتوں کے کھانے کا بھی خیال تھا اور بلیوں کے علیحدہ کھانا تیار ہو رہا تھا۔ یہ گھر اتنا بڑا تھا کہ سو لوگ بھی آتے تو اس میں سما سکتے تھے۔ مگر صرف تین افراد اور پلٹن نوکروں کی اس میں رہتی تھی۔ مجھے رہ رہ کر ریو کے غریب لوگ جو فٹ پاتھ پر بے آسرا اور بے سرو سامان بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے اور سوچ رہی تھی نہ جانے خدا کی کیا حکمت ہے کہ کسی کو امیر بنایا ہے تو بے انتہا نوازتا ہے اور کسی کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملتی۔ شاید خدا دلوں کے راز جانتا ہے اور انسان کی نیتوں کا پھل دیتا ہے۔ کیتھرین بڑی با اخلاق اور ملنسار لگ رہی تھی۔ ضرور اس میں کوئی ایسی بات ہے جو خدا کو بہت پسند ہے جو اس نے کیتھرین کو اتنا نوازا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی۔ جدید قسم کی عمدہ قسم کی ڈائننگ ٹیبل جس پر بے شمار چائے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ویٹر ادھر سے ادھر پھرتی کے ساتھ چل پھر رہے تھے۔ مطلوبہ قسم کے مشروب پلانے میں مصروف تھے۔ کئی خواتین وہسکی' شیمپین اور وائن پینا پسند کر رہی تھیں۔

میز سے لگا ہیں ہٹی ہی تھیں کہ سامنے شوکیسوں پر سونے اور چاندی کے ظروف نظر آئے۔ اٹلی' فرانس' اور انگلینڈ کی کٹلری اور کراکری سجی ہوئی تھی۔ گھر کم بلکہ کوئی شیش محل زیادہ نظر آ رہا تھا۔ ہر کوئی چائے کی تعریف کر رہا تھا۔ چائے اتنی پر تکلف تھی کہ ایک قسم کا کھانا ہی تھا جو سب لوگ بڑی رغبت کے ساتھ کھا رہے تھے۔

خواتین باتیں بھی کر رہی تھیں اور کھا بھی رہی تھیں۔ میں نے کیتھرین سے پوچھا۔

''آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ یہاں کی خواتین کیا یورپ اور امریکہ سے مختلف ہیں کہ ایک جیسی ہیں۔''

کیتھرین نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہماری غریب عورت بھی وفادار ہے اور امیر بھی۔ ایک بار شادی ہو گئی تو نبھاتی ہیں۔ بار بار شادیاں نہیں کرتیں۔ بلکہ کبھی کبھار ہمارے ملک کے مردان کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور یہ بے چاریاں اپنا اور بچوں کا پیٹ اکیلے ہی پالتی ہیں۔''

مجھے ریو کی عورتوں کے بارے میں جان کر حیرت ہوئی تھی ورنہ اکثر یورپین عورتیں اور مرد دوسری شادیاں رچا لیتے ہیں۔ اور بچوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر ریو کی خواتین میں قناعت پسندی ہے۔ خاوند کا گھر اور بچے نہیں چھوڑتی ہیں۔

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ کیتھرین نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ نے یہاں کی عورتوں کے بارے میں پوچھ لیا ہے' اپنے بارے میں بتایا ہی کچھ نہیں ہے۔''

''ہمارے سسٹم ہی نرالے ہیں۔ ہماری شادیاں دو خاندانوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ لڑکا اور لڑکی کی مرضی سے نہیں۔''

''کیا کوئی پسند کی شادی نہیں کرتا؟''

"کافی ایسے بھی ہوتے ہیں جو پسند کی شادی کرتے ہیں مگر ان کے والدین شادی میں باقاعدہ شامل ہوتے ہیں کوئی ایسا ہزاروں میں ایک لڑکا یا لڑکی ہوگی جو اپنی مرضی سے شادی کرے۔"

"جو مرضی سے کرتے ہیں ان کے نتائج کیا نکلتے ہیں؟"

"بہت دیر تک دو خاندانوں میں ناراضگی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ یا تو آخر میں صلح ہو جاتی ہے اور یا طلاق"

"اف کتنا الٹ رواج ہے۔"

"ہماری لڑکیوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنا پڑتا ہے۔ سب کی خدمت کرنا پڑتی ہے۔ ہر ایک کو توقع ہوتی ہے کہ وہ ہمارے اشاروں پر چلے۔ لڑکی اشاروں پر چلتی رہے تو خوش رہتے ہیں اور اگر من مانی کرے تو اس سے ناراض رہنے لگتے ہیں۔ ساس اکثر حکومت کرتی ہے۔"

"توبہ ساس"

کیتھرین نے قہقہہ لگایا۔

"اگر کوئی ساس ہمارے ساتھ رہنے لگے تو ہماری سانسیں بند ہو جائیں۔ ہم لوگ تو اپنی مرضی سے شادیاں کرتے ہیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ آپ لوگوں کو جہیز بھی بہت دینا پڑتا ہے۔"

"جہیز تو میرے خیال سے سبھی کو دینا پڑتا ہے۔"

اب میں اس کو کیا بتاتی' جہیز کے ساتھ ساتھ کیا کچھ دینا پڑتا ہے۔ اپنے ملک کا بھرم رکھتے ہوئے میں نے پوچھ لیا تھا کہ آپ کو بھی تو کچھ دینا پڑتا ہے۔

وہ بتانے لگی۔

"ہم لوگ اپنی مرضی سے دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ سسرال والوں کے ڈر سے کہ اگر ان کو نہ دیا تو کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔"

کیتھرین کی باتیں سب غور سے سن رہی تھیں۔ سب لوگوں کی رائے تھی کہ واپس ہوٹل جایا جائے کیونکہ تمام حضرات اپنی بیویوں کا انتظار کر رہے تھے۔ واپسی پر میں ریو کی عورتوں کے بارے میں ایک اچھا تاثر لے کر لوٹی تھی۔

پاکستان جانے کے لیے ابھی چار روز باقی تھے۔ ریو کے بازار اور شاپنگ پلازہ دیکھنے کے لیے تجسس پیدا ہو رہا تھا۔ اور لندن کا ویزہ لگوانا بھی ضروری تھا۔ واپسی پر لندن کے راستے پاکستان جانا چاہتی تھی۔

ہوٹل کے کمرے سے نکل کر ہم ناشتہ کے لیے ریستوران میں چلے گئے۔ وہاں پہلے سے ہی بہت رش تھا کوئی وفد پہلے سے ہی براجمان تھا۔ شاید جرمنی سے یہ لوگ سیر کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔

وہیں بوفے کی صورت میں ناشتہ کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ چند روز میں ویٹر لڑکا اور ویٹرس لڑکی سے ہماری جان پہچان ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چائے بنا کر لے آتی تھی اور ساتھ ہی دودھ گرم کر کے لے آتی تو میں حیران سی اس کا منہ دیکھتی جس پر وہ سوائے مسکراہٹوں کے کوئی اور چیز نمایاں نہیں ہوتی تھی۔

پاسپورٹ پرس میں ڈالے اور برٹش ایمبیسی جانے کے لیے نیچے ریسپشن پر پہنچ کر ہوٹل کے منیجر سے رجوع کرتے ہوئے کہا کہ پرتگالی میں برٹش ایمبیسی کا نام لکھ دے تا کہ ہم آسانی سے وہاں پہنچ پائیں۔

منیجر نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذ پر پورا پتہ لکھ دیا اور ہم ہوٹل سے باہر نکل کر سڑک پر چل پڑے۔ آس پاس کی دکانوں میں اور بازار میں خاصی گہما گہمی تھی۔

ٹیکسی کو کرایہ دینے کے لیے ڈالر کی بجائے وہاں کی کرنسی ریاز کی ضرورت تھی۔ اس وقت امریکن ڈالر پرس میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک فرلانگ کے فاصلے پر بنک تھا جہاں آسانی کے ساتھ کرنسی تبدیل ہو جاتی تھی۔ بینک پہنچ کر دیکھا تو اس کا دروازہ مقفل تھا۔ کالی گرلوں والا دروازہ بند دیکھ کر مایوسی ہوئی مگر دروازے کے باہر گھنٹی کو دیکھا اس پر انگلی رکھی ہی تھی کہ ایک لڑکے نے اندر سے تالا کھولا اور اندر آنے کی اجازت دے دی۔ جتنی بھی کرنسی تبدیل کروائی تھی وہ ہوٹل میں ہی کرواتے رہے تھے۔ مگر اس مرتبہ فارغ تھے سوچا بینک سے ہی کروالیں بینک میں داخل ہو کر سو امریکن ڈالر اس کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے کو دیئے اور اشاروں سے اور منہ سے ریاز کہا تو وہ مسکرایا۔

قریب ہی پڑی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”یہاں بیٹھ جائیں۔“

”ہم سمجھ گئے کہ یہ بیٹھنے کے لیے کہہ رہا ہے۔“ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھا سی ریاز لے آیا تھا یعنی ہوٹل سے تین ریاز زیادہ تھے۔ روپے لے کر ہم نکلے ہی تھے کہ اس لڑکے نے ایک بار پھر دروازہ بند کر کے اس میں لاک لگا دیا تھا۔

”یہاں کے لوگ اندر سے تالا کیوں لگاتے ہیں؟“

”یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ خطرے کی بنا پر تالا لگاتے ہیں۔“

ریاض کی بات سمجھ آ گئی تھی کوپا کبانہ کے بازار جو بڑے ہی بارونق تھے لوگ آ رہے تھے اور دکانوں میں داخل ہو رہے تھے۔ سوائے کھانے پینے کی دکانوں کے کہیں اور اتنا رش نہیں تھا۔ ہر جگہ مہنگائی کا رونا رویا جا رہا تھا۔ اس ملک میں جتنی غربت تھی اتنی ہی مہنگائی تھی۔ سفید اور کالے پرانے سے پتھر جو کہیں کہیں سے ٹوٹے بھی تھے چوڑا سافٹ پاتھ اور کہیں کہیں کوڑا کرکٹ بھی نظر آ جاتا تھا۔ آج ہمیں ایمبیسی پہنچنے کی اتنی جلدی نہیں تھی' مزے مزے سے دکانوں کی ونڈو شاپنگ کرتے ہوئے ساحل سمندر کے قریب جا رہے تھے۔ سڑک پر موٹروں کے علاوہ پیلی ٹیکسیاں نظر آ رہی تھیں۔

اشارے سے ایک ٹیکسی کو روکا تو وہ سڑک کے کنارے ہمارے قریب آ کر رک گئی تھی۔ ریاض نے برٹش ایمبیسی کا پتہ اس کو دکھایا تو اس نے اشارے سے سر ہلاتے ہوئے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ جگہ کدھر ہے۔ ہم جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ڈرائیور نے ٹیکسی چلاتے ہوئے پرتگالی میں کچھ کہا' مگر ہم نے اس کا جواب انگریزی میں دیا تو وہ بولا۔

''نو انگلش''

یعنی انگریزی نہیں آتی۔ خیر پرچہ اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کی ٹیکسی سڑک پر بھاگنے لگی تھی۔ ریو میں ٹریفک بھی دوسرے ملکوں کی طرح اتنی نہیں تھی جتنی کہ امریکہ میں ہوتی ہے۔ جتنی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور اس کے حساب سے اتنی ہی ٹیکسیاں تھیں۔

ٹھیک ایک عمارت پر برٹش کا جھنڈا لہرا رہا تھا اس کے پورچ میں جا کر اس نے گاڑی کھڑی کر دی تھی۔ میٹر کے مطابق اس کو روپے دیئے اور وہ چلتا بنا تھا۔

لندن کا ویزہ

برٹش ایمبیسی کا دروازہ کھولنا چاہا تو وہ بھی اندر سے مقفل تھا۔ کال گرل والا دروازہ تھا۔ اندر سے لابی اور اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ دائیں طرف دیوار کے گھنٹی لگی ہوئے تھی۔ اس کو بجایا تو دائیں جانب سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے ہم دونوں کو اندر سے بڑے غور کے ساتھ دیکھا۔ جب اچھی طرح سے جائزہ لے چکا تھا' اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے سیڑھیوں کی طرح اشارہ کر دیا کہ اوپر چلے جاؤ۔

اوپر پہنچ کر چھوٹی سی راہداری پر ایک کرسی پر ایک شخص بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر رجسٹر رکھا ہوا تھا اس نے ہم دونوں کے دستخط کروائے اور بند کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وہاں پر بھی دیوار پر گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ اس کو دبایا تو تھوڑی دیر کے بعد ایک خاتون برآمد ہوئی۔

اس نے گڈ مارننگ کہا اور اندر آنے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ چھوٹی سی انتظار گاہ تھی کچھ لوگ صوفوں پر بیٹھے تھے۔ سامنے میز پر بہت سارے رسالے رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر ملکہ الزبتھ کی تصویریں آویزاں تھیں۔ اسی کمرے کے سامنے شیشے کے پیچھے ایک لڑکی نے آ کر کھڑکی سے پوچھا۔۔۔۔۔۔۔ کس لیے آئے ہو؟

میرے میاں پاسپورٹ لے کر اس کے پاس چلے گئے تھے اور بتانے لگے کہ میرا ویزہ لگ چکا ہے' میری بیوی کا ویزہ اس میں نہیں ہے۔

''بیوی کا کیوں نہیں لگوایا؟''

''میں جلدی میں آیا ہوں' کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ اس کا ویزہ لگوا سکتا۔''

اس لڑکی نے پاسپورٹ لیے اور دوسرے کمرے میں جہاں پر کونسلر جنرل بیٹھا ہوا تھا اس کے پاس لے گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اسی کھڑکی میں آن کر کھڑی ہو کر دوسرے لوگوں سے رابطہ قائم کرنے لگی تھی۔ خدا کا شکر کر رہے تھے کہ ایک یہ واحد ریو میں ایسی جگہ تھی جہاں پر ہم کھل کر بات چیت کر سکتے تھے' اپنا مدعا بیان کر سکتے تھے ورنہ تو جب سے آئے تھے گونگوں کی طرح ان لوگوں سے بات چیت کرنی پڑتی تھی۔

تیری بیوفائیاں!

ابھی میں وہاں پر بیٹھی ہی تھی کہ ایک خاندان آ گیا تھا انہیں بھی شاید لندن کا ویزہ لگوانا تھا۔ وہ بھی چپ چاپ بڑی خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ ایک خاتون جو کہ اہل خانہ لگتی تھی' تمام پاسپورٹ لے کر کھڑکی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس نے بھی پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیئے تھے اور واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

میں نے اپنے میاں سے سرگوشی میں بات کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کا کیا خیال ہے کہ ویزہ لگ جائے گا؟''

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں' پاسپورٹ لے کر گئی ہے' ہو سکتا ہے لگ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ نہ ہی لگے۔''

''ایک ہفتہ ہمارے پاس تھا اگر لگ جاتا تو ہم لندن کی بھی سیر کر لیتے۔''

''میں کونسلر تو ہوں نہیں تمہارا پاسپورٹ دیکھوں اور فوراً ٹھپہ لگا دوں۔'' ریاض نے ایسا جواب دیا کہ مجھے غصہ سا آ گیا تھا۔

''آپ صحیح بات نہیں بتاتے۔''

''بھئی صحیح تو بتا دیا ہے۔''

میں نے توجہ آنے والی لڑکی کی طرف کرلی تھی۔

ایک لڑکی میرے قریب آن کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پاسپورٹ تھا اور وہ خاصی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ اتنی پریشان تھی کہ میرا دل پسیج گیا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔

''آپ بہت پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔''

''ہونہہ'' وہ خاموش ہوگئی۔ اپنا پاسپورٹ کھڑکی میں کھڑی لڑکی کو دے کر وہ واپس میرے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی اور پوچھنے لگی تھی۔

''کیا آپ بھی لندن کے لیے ویزہ لگوانے آئی ہیں؟''

''جی'' میں نے مختصر سا جواب دیا' مگر اس کی اداسی دیکھ کر میں نے پوچھ ہی لیا تھا۔

''تو کیا آپ لندن میں رہتی ہیں؟''

''رہتی تھی۔''

''یعنی۔۔۔۔۔۔؟''

''میں ریو میں شادی کے بعد آ گئی تھی' مگر اب میں پھر لندن جا رہی ہوں ہمیشہ کے لیے۔''

''کیوں؟''

میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بس جس لڑکے سے شادی کی تھی وہ بے وفا نکلا ہے۔''

''کیا بے وفائی کی ہے؟''

''جورج مجھے لندن میں ملا تھا' جب میں اسٹوڈنٹ تھی۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ میں نے ماما سے کہا کہ میں جورج سے شادی کروں گی تو ماما نے جواب دیا تھا کہ بے شک تم جورج سے شادی کرلو مگر دوسرے ملک میں لے جائے گا نہ جانے وہاں کے لوگ کیسے ہیں اور تمہیں کیسے رکھے۔۔۔۔۔۔ تو میں نے ماما کو جواب دیتے ہوئے تسلی دی تھی کہ جورج مجھے بہت چاہتا ہے' بہت اچھا رکھے گا۔ مگر چھ ماہ کے بعد وہ کہیں روپوش ہوگیا تھا۔ میں نے بہت ڈھونڈا مگر اس کا کہیں اتا پتہ نہیں ہے۔ ملنے والوں سے پوچھا تو انہوں نے بھی لا

تعلقی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔۔۔ہم صرف ایک سال سے اسے جانتے تھے' ہمیں بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ چار ماہ انتظار کرنے کے بعد یہی سوچا ہے کہ واپس لندن ماں کے پاس چلی جاؤں' یہاں رہ کر اندازہ ہوا ہے کہ یہاں کی عورت کا کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ یہی حرکت اگر ہمارے ملک میں کرتا تو ہماری حکومت نہ صرف اس سے طلاق دلواتی بلکہ جس گھر میں میری رہائش ہوتی وہ گھر بھی میرے نام کر دیتی۔ اب رہ رہ کر ماما کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ دوسرے ملک میں جا کر کہیں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ چکے تھے۔ عورت ہونے کے ناطے میرا دل دکھی ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا آپ کی ماما کو اطلاع ہے کہ جورج کہیں چلا گیا ہے؟''

وہ دھیرے سے بولی۔ ''میں نے ماما کو سب کچھ بتا دیا تھا اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم واپس آ جاؤ' اس لیے میں واپس جا رہی ہوں۔''

''ویزہ لگوانا ہے کیا؟''

''مجھے ویزے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں تو یہاں آ کر بتانا چاہتی ہوں کہ وطن جا رہی ہوں اگر میرے بارے میں معلوم کرنے آئے تو بتا دیں کہ میں ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔''

وہ دکھ بھرے لہجے سے گویا ہوئی تھی اور مجھے رہ رہ کر اس لڑکے پر غصہ آ رہا تھا کہ اسے چھوڑ کر کیوں چلا گیا ہے۔ مگر یہ میں صرف ایک عورت کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا ہوگا' نہ جانے کتنی اور لڑکیوں کو دھوکہ دے چکے ہوں گے۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اس ملک میں غربت کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک کی طرح فراڈ بھی ہے۔

گرم چائے میں گرم دودھ

فیشن مال' بارہ شاپنگ سنٹر' ریو مال اور ریوسل بہترین قسم کے شاپنگ سنٹر تھے۔ اندرون شہر سے نکل کر جونہی شاپنگ مال میں آئے تو حیرت گم ہو گئی تھی۔

''ارے یہ تو غریب ملک ہے اور اس قدر عمدہ شاپنگ مال ہیں۔ باہر کے ملکوں میں شاپنگ سنٹر کو شاپنگ مال کہتے ہیں۔

کہاں سڑکوں پر اور فٹ پاتھوں پر کچرا بکھرا نظر آئے گا' مگر آپ اگر کسی اعلیٰ قسم کے مال میں جائیں گے تو حیرت گم ہو جائے گی۔ کسی لحاظ سے بھی وہ دوسرے ملکوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ چمکتے فرش' بہترین اعلیٰ کوالٹی کی چیزیں جو انتہائی مہنگی ملیں گی۔ کیا غریب

اور کیا امیر ہر طرح کے لوگ اس مال میں شاپنگ کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر اس مال میں ہمارے مطلب کی کوئی شے نہیں تھی۔ اس لیے باہر آ کر ایک بار پھر ٹیکسی پر بیٹھے اور ریو سل (Rio Sul) میں چل گئے تھے۔

اس مال کے اندر کئی منزلیں تھیں۔ اگر کسی میک اپ کے سٹور میں گھسے ہیں تو ہر چیز کا نام پرتگالی میں لکھا ہوا ملے گا۔ اگر کپڑوں کی دکان ہے تو اس پر بھی نام پرتگالی میں ملے گا۔

اس مال کے سنٹر میں بڑا سا فوارہ لگا ہوا تھا۔ چمکتے ہوئے فرش تھے۔ صاف ستھری چیزوں سے بھری دکانیں تھیں۔ ایک جگہ ڈائننگ ایریا تھا جہاں پر ہر طرح کے کھانے یعنی چائنیز' پرتگالی' میکڈونل اور پیزہ۔۔۔۔۔۔ ایک طرف آئس کریم پارلر کی دکانیں' کافی اور چائے کے ریستوران غرض کہ ایک جہان سمایا ہوا تھا۔ خاص چیز جو اس مال میں تھی وہ برازیل کے بنے لیدر کے جوتے تھے جو کہ بہت ہی مہنگے تھے۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو کہ سستی ہو۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی چلے جائیں تو آپ کو دکان کے باہر انگریزی میں لکھا ہوا نام ضرور ملے گا۔ اگر فرانس میں گئے ہیں تو فرانسیسی نام کے ساتھ ساتھ انگریزی میں نام لکھا ہوگا۔۔۔۔۔۔ بنکاک' تھائی لینڈ میں چلے جائیں تو وہاں پر بھی انگریزی میں بات چیت اور دکانوں کے باہر انگریزی میں لکھے نام ضرور مل جائیں گے۔

مگر ریو میں ایسا نہیں تھا۔ مطلوبہ چیز دیکھنے میں تو صحیح معلوم ہو رہی ہوتی ہے مگر اس چیز کے بارے میں اگر آپ پوچھیں گے تو اس کو بتانے میں کوئی بندہ جو انگریزی جانتا ہو اس کو ڈھونڈ لانے میں گھنٹوں صرف کر دیتے ہیں۔ یہی حال خوراک کا بھی تھا۔ دل ہی دل میں خدا سے پوچھتی تھی کہ میں کدھر آ گئی ہوں۔۔۔۔۔۔ سوائے لیڈا کے کسی پرتگالی خاتون کو اتنی اچھی انگریزی نہیں آتی تھی۔

ریو کے مال میں ایک ریستوران میں بیٹھے ہوئے سوچا کہ چائے ہی پی جائے بڑی مشکلوں سے اسے سمجھایا کہ ہمیں کالی چائے پینی ہے۔ خیر اس کے دماغ میں یہ بات آ گئی اور وہ چائے دانی میں لپٹن کے ٹی بیگ ڈال کر لے آئی تھی۔ چینی اور چائے سامنے تھی مگر دودھ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

میں نے اشارے سے ویٹرس سے پوچھا۔

''ہمیں دودھ چاہیے۔''

تو وہ میرا منہ دیکھنے لگی تھی جیسے میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو۔ وہ مجھے دیکھتی جا رہی تھی اور میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جو چائے میں ڈالتے ہیں مگر وہ سمجھ نہ پائی اور کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنے چلی گئی جس کو انگریزی آتی ہو۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد ایک شخص کو لائی جو کہ نہایت ہی ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”ملک (Milk) چاہیے۔“

اوہ ملک (Milk)۔۔۔۔۔۔۔اس نے دودھ کا ٹھنڈا ڈبہ میرے سامنے رکھ دیا تھا اور کہا کہ یہاں کوئی بھی چائے یا کافی کے ساتھ دودھ نہیں لیتا۔ دودھ کو ہاتھ لگایا تو تب تک چائے کا عالم بھی کچھ اس قسم کا ہو گیا تھا۔ میں نے اس شخص سے کہا۔

”وی وانٹ ہوٹ ٹی۔۔۔۔۔۔“

وہ مسکرایا اور پرتگالی میں اس لڑکی کو سمجھانے لگا کہ یہ گرم چائے اور دودھ بھی گرم مانگ رہے ہیں۔ وہ حیران ہو کر کچن میں چلی گئی تھی۔

ایک گھنٹہ کی کشمکش میں ہم صرف اس مال میں چائے پی سکے تھے۔

اس کے بعد ایک جوتوں کی دکان میں گھس گئے تھے۔ وہاں پر شوکیس کے باہر قیمتیں لکھی ہوئی تھیں۔ خیر اس دکان میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس ملک میں جا کر ایک تجربہ ضرور ہوا تھا کہ صرف انگریزی کا سہارا لے کر دوسرے ملک میں نہ جایا جائے۔ اس ملک کے چند الفاظ جو کہ ضروری ہیں کم از کم ان کو سیکھ لینا چاہیے۔ میں تو خدا کا یہ شکر کرتی رہی کہ ہم لوگوں کو انگریزی آتی تھی ورنہ اردو زبان تو اس پورے ملک میں کسی کو بھی نہ سمجھ آتی اور قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

میں ریاض کے ساتھ اس ریستوران میں بیٹھے ہوئے ریو کے لوگوں پر غور و خوض کرنے لگی تھی۔ ایک خاتون اپنے دو بچوں کے ساتھ ریستوران سے منسلک آئس کریم پارلر پر ان کو آئس کریم کھلانے لائی تھی۔ براؤن سکرٹ پر اس نے پیلا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ بیٹا اور بیٹی آئس کریم کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔

وہ کافی پینے کے لیے ہماری میز کے قریب والی میز پر بیٹھ گئی تھی۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ مسکرائی اور پوچھنے لگی۔

”آپ ٹورسٹ ہیں؟“

اس کو انگریزی بولتے دیکھ کر میں حیران ہو گئی تھی۔

”میں نے سکول میں انگریزی پڑھی تھی جو مجھے کام آ گئی ہے۔ جب بھی یورپ جاتی ہوں مجھے دشواری نہیں ہوتی۔“ اس کی باتوں سے مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی' چلو کوئی بات چیت کرنے والا ملا ہے۔“

”کیسا لگا ہے ریو آپ کو؟“

”اچھا ہے۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا تھا۔

''ایک لحاظ سے بہت اچھا ہے اور کسی لحاظ سے اچھا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے ملک میں دیکھتے ہی دیکھتے مہنگائی ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے مہنگائی بھی نہیں تھی اور چیزیں بھی سستی ملتی تھیں۔ لیکن شاید ساری دنیا میں مہنگائی ہوگئی ہے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' ساری دنیا میں اس کا اثر پڑا ہے' خاص کر کے ہم لوگوں کو تو آپ کا ملک بہت ہی مہنگا لگا ہے کیونکہ ہماری کرنسی کی ویلیو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''اچھا' آپ کی کرنسی کی ویلیوز کم ہیں؟''

''بالکل چالیس روپے بدلے آپ کا ایک ریاز ملتا ہے یعنی ایک روپیہ ہمارے چالیس روپوں کے برابر ہے۔''

''اوہ۔۔۔۔۔۔۔اس قدر ویلیو کم ہے۔۔۔۔۔۔۔کمال ہے آپ کیسے یہاں سیر کرنے آگئے ہیں؟''

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔''ہم لاء کانفرنس اٹینڈ کرنے آئے ہیں۔''

جب اسے معلوم ہوا کہ میں رائٹر ہوں تو وہ اچھل پڑی جیسے کوئی بہت بڑی بات میں نے اس کو بتادی تھی۔

''اچھا آپ ادیبہ ہیں؟''

''ہاں''

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمارے ملک میں ہر فن کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ کیا آپ کے ملک میں بھی ایسا ہے؟''

''ہمارے ملک میں۔۔۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔۔۔ہے' مگر۔۔۔۔۔۔۔''میں خاموش ہوگئی تھی۔

اب اپنے ملک کی باتیں ایک انجان خاتون کے سامنے کیسے کرتی کہ بڑے اعلیٰ پائے کے فنکار چاہے آرٹسٹ ہو یا ادیب ہو' ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کسمپرسی کی حالت میں پایا جاتا ہے۔ میں نے کسی قسم کی بات بتانے سے گریز کیا تھا۔

بلکہ اس کے ملک کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرتی رہی تھی۔ وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔''کیا جلدی ہے گھر پہنچنے کی؟''

''ہاں' میں بچوں کے ساتھ اکیلی آئی ہوں۔ شہر کی پہاڑی کے اوپر میرا گھر ہے اور دن بدن ہمارے ملک کے حالات ناگفتہ بہ ہوتے جارہے ہیں۔ سرشام ہی ہمیں گھروں کو لوٹ جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہاں جرائم بہت زور پکڑ چکے ہیں۔ جب بھی انہیں کوئی اکیلی عورت نظر آتی ہے تو فوراً اسے لوٹ لیتے ہیں۔ ایک تو شام بہت جلدی پڑ جاتی ہے اور رات ہوتے ہی پتہ ہی نہیں چلتا ہے۔''

''ابھی تو پانچ نہیں بجے ہیں۔''

''ابھی سے شام ڈھلنی شروع ہو جائے گی۔''

''جرائم کیوں زیادہ ہو رہے ہیں؟''

''اس ملک میں انتہا کی غربت ہے' بے روزگاری عام ہے' لوگوں نے لوٹ کھسوٹ کو اپنا پیشہ بنالیا۔''

''مگر میں جب سے آئی ہوں میں نے گداگری کرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔''

میری اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''گداگری کی نوبت ہی نہیں آتی ۔ بن مانگے ان کو سب کچھ مل جاتا ہے۔ گداگری میں وقت لگتا ہے اور لوٹنے میں چند لمحے لگتے ہیں۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ اپنے ملک کی باتیں بتانی پڑتی ہیں بلکہ آپ کو بھی محتاط کر رہی ہوں' جلد از جلد آپ بھی گھر کو لوٹ جائیں۔''

اس نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا جو ہر چیز سے بے نیاز آئس کریم کھانے میں مصروف تھے۔ ماں نے ایک دو مرتبہ انہیں جلدی کھانے کے لیے کہا مگر وہ آرام آرام سے کھا رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر مجھ سے متوجہ ہوئی۔

''یہاں پر زبان کا مسئلہ تو درپیش آیا ہوگا۔''

''بہت زیادہ''

میرا دماغ ابھی تک الجھا ہوا تھا جو اس نے کہہ دیا تھا کہ دن دہاڑے لوٹ لیتے ہیں۔ دل میں بے چینی سے لگ گئی تھی کہ جلد از جلد واپس ہوٹل پہنچ جائیں۔ جس شاپنگ پلازہ میں ہم بیٹھے تھے یہ ہوٹل سے کافی دور تھا۔ مگر ابھی شاپنگ تو کی ہی نہیں تھی۔ سامنے جوتوں کی دکان نظر آ رہی تھی۔ وہاں پر رش کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دکان خالی ہو گئی تھی اور سرِ شام ہی وہ شاپنگ سنٹر بند ہو گیا تھا۔

میں ہوٹل کی سمت واپس آتے ہوئے سوچ رہی تھی' چاروں طرف حالات بگڑ چکے ہیں۔ جہاں جاؤ' بس یہی آواز آتی ہے کہ حالات ٹھیک نہیں۔ کبھی بھی لٹیرے لوٹ سکتے ہیں۔ کسی زمانے میں بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ اس قسم کے حالات اپنے ملک میں نہیں ہیں مگر اب تو ہر جگہ اسی قسم کے حالات پیدا ہو رہے ہیں۔

شاپنگ مال

آج بارہ شاپنگ مال پر چلے گئے تھے۔وہاں پر بھی اتنا بڑا مال مگر لندن امریکہ کی طرح لوگوں کی بھیڑ نہیں تھی۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں پر اتنے لوگ کیوں نہیں ہیں۔پھر اس خاتون کے کہنے کے مطابق اندازہ لگا لیا تھا کہ انتہائی غربت ہونے کی صورت میں لوگوں کا ہجوم نہیں ہے۔چند لیڈا جیسے گھرانے ہی ہوں گے جو یہاں پر آ کر شاپنگ کرتے ہوں گے۔

یہ مال بھی نہایت ہے خوبصورت تھا۔ضرورت کی ہر شے اس مال میں موجود تھی۔یہاں پر بھی جوتے خوبصورت ڈیزائنوں میں شو کیسوں میں سے نظر آ رہے تھے۔چمڑے کے پرس اور پتلون پر لگانے والی بیلٹیں بھی یہاں کی خاص سوغات تھیں مگر ان کی قیمتیں تو برازیل میں لندن سے بھی زیادہ تھیں۔

''یہ کس قسم کا غریب ملک ہے؟''میں نے ریاض سے پوچھا۔

''غریب ملک ہے مگر یہاں پر امیر ترین لوگ بستے ہیں۔یہاں پر بھی پاکستان والا حال ہے۔''

میاں کی بات میرے دل کو لگی تھی۔میں ایک میک اپ کی دکان پر چلی گئی تھی۔وہاں پر کاسمیٹک اور پرفیوم رکھے ہوئے تھے۔جس چیز کو اٹھاتی تو وہاں پر پرتگالی میں ان کے نام لکھے ہوئے تھے۔شیمپو کی بوتل کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ شیمپو ہے مگر کچھ ایسی چیزیں تھیں جیسے منہ پر لگانے والی کریموں کے بارے میں اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کس مقصد کے لیے ہیں۔سر کھپائی کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔میں چپکے سے باہر نکل آئی تھی۔دیگر دکانوں میں بھی وہاں کی زبان کے مطابق نام لکھے ہوئے تھے۔موسم سرما کے ملبوسات بڑے کم دکھائی دے رہے تھے۔شاید وہاں کا موسم بڑا ہی خوشگوار تھا اس لیے سویٹریں وغیرہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔

اس مال میں بھی ایک جہان کی چیزیں سمائی ہوئی تھیں۔لوگ بڑے پرسکون طریقے سے شاپنگ کر رہے تھے۔خاص کر کے بچوں کی مائیں شاید یونیفارم لینے کے لیے آئی تھی۔بچے خاموشی سے ماؤں کے قریب کھڑے تھے۔اور ریو کی خاص زبان میں آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔یونی فارم کی دکان سے ہٹ کر میں ایک سیل کی دکان پر آ گئی تھی۔یہ دکان بھی جوتوں کی ہی تھی۔ایک ریک پر سیل تھی باقی تمام جوتے اصلی قیمت پر رکھے ہوئے تھے۔میں نے سیل کے ریک سے ایک جوتا اٹھایا تو اس کی قیمت اصلی جوتے سے بھی زیادہ تھی۔یا وہ بہت عمدہ چمڑے کا بنا ہوا تھا۔

وہ جوتا بھی وہیں رکھ دیا تھا۔

ایک جگہ فوارہ لگا ہوا تھا۔اور سامنے آئس کریم کی دکان اور میک ڈونلڈ کی دکان تھی۔یہاں پر کافی گہما گہمی تھی'میں وہاں فوارے کے قریب بنچ پر بیٹھ گئی تھی۔کوئی کسی کے متعلق سوچتا ہی نہیں تھا۔کہ وہ کیا ہے اور یہاں کیا کرنے آیا ہے۔سب اپنی اپنی دھن میں

مست تھے۔ کچھ چہرے ایسے بھی دکھائی دے رہے تھے جو خاصے پراسرار تھے۔ خاص کر کے کئی مرد میکڈونل میں کھڑے نہ جانے مجھے کیوں وارداتی دکھائی دینے لگے تھے۔ ان کے چہروں پر جرائم کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔

میں ابھی اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ آئس کریم کی دکان پر کھڑی ایک خاتون نے اشارے سے بلایا تھا میں جلدی سے اس کے پاس چلی گئی تھی۔ وہ بچوں کو آئس کریم دلا کر میرے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے انگریزی میں کہنے لگی۔

''آپ انڈیا سے ہیں یا پاکستان سے؟''

''میں پاکستان سے آئی ہوں۔''

''سوری' میں نے اس لیے بلوایا ہے' وہ جگہ ٹھیک نہیں ہے خاص کر کے وہ لوگ۔۔۔۔۔۔''

وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اتنا ہی سنا تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس وقت میں اکیلی تھی۔ میاں جوتوں کی دکان پر اپنے لیے جوتا پسند کر رہے تھے۔ میں اس خاتون کی شکر گزار بھی تھی کہ اس نے مجھے بروقت بتا دیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پرس کو مضبوطی سے تھاما اور اس سے پوچھنے لگی۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ لوگ ٹھیک نہیں ہیں؟''

''میں یہاں کی رہنے والی ہوں۔''

''تو آپ کو ڈر نہیں لگتا ہے؟''

''زبان کا مسئلہ بھی تو ہے۔۔۔۔۔۔ گو کہ میکڈونل اور آئس کریم کا یہ ایریا خطرناک نہیں ہے مگر چند لوگ خطرناک آ گئے تھے۔ آپ اکیلی تھیں۔ حالانکہ میں یہاں کی رہنے والی ہوں' مدد کے لیے لوگوں کو اکٹھا کر سکتی ہوں مگر آپ انگریزی بولیں گی تو کسی کو سمجھ نہیں آنی تھی۔ اور زیادہ تر ٹورسٹ کو لوٹتے ہیں۔ اس کی بات سن کر مجھے اور بھی دہشت آ گئی تھی۔ جہاں جاؤ' بس اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ نہ جانے اس دنیا میں جلد قیامت آنے والی ہے۔ میں نے سوچا ہی تھا کہ وہ گویا ہوئی۔

''میں خود بھی تو وہاں پر زیادہ دیر کھڑی نہیں ہوئی ہوں۔'' وہ جوتوں کی دکان کے سامنے مجھے لاتے ہوئے بتانے لگی تھی۔

''اگر ایک بار ان لوگوں کی سمجھ آ جائے تو یہ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔''

''آپ کتنے سالوں سے یہاں ہیں؟''

''ہم۔۔۔۔۔۔؟'' وہ مسکرائی۔

''جب سے پیدا ہوئی ہوں' یہاں پر ہی ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

''کیا اسی قسم کے لوگ اس شہر میں ہیں۔''

''ہر کوئی چور تھوڑا ہی ہے۔ بس غربت کی وجہ سے یہ لوگ مجبور ہیں۔ بے روزگاری سے ان کے دماغ پھر گئے ہیں۔''

''بے روزگاری یہاں پر بھی ہے؟''

''ہاں''

میں سمجھے ہوئے تھی صرف بے روزگاری پاکستان میں ہی ہے' مگر یہ ملک بھی بڑی کسمپرسی کی حالت میں مبتلا تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''مگر امیروں کے انداز نرالے ہیں۔ ہر امیر بندہ اسی طرح سے رہتا ہے جیسے کوئی رائل خاندان رہتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ملک مہنگا نہیں ہے۔ مہنگائی تو صرف غریبوں کے لیے یا ہماری کلاس کے لیے ہے' جو بڑی دوراندیشی کے ساتھ وقت پاس کرتے ہیں۔''

میں اس خاتون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جوتوں کی دکان کے اندر داخل ہوتے ہوئے ریاض سے مخاطب ہوئی۔

''میرا خیال ہے یہاں سے اب چلتے ہیں۔''

''آنے کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے اور جانے کے لیے بھی بے تاب ہوتی ہو۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے سارا واقعہ جب سنایا تو ریاض نے تشویش بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''میں تو تم سے پہلے ہی کہتا تھا کہ اتنی بہادری نہ دکھایا کرو۔ منٹ میں غائب ہو جاتی ہو۔''

''بھئی چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی۔''

''یہاں پر کھڑے کھڑے ہی جائزہ لے سکتی ہو۔''

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''پھر تو ریو آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی وہاں پر بیٹھے بیٹھے اندازہ لگا سکتی تھی کہ شہر کیسا ہوگا۔''

''اس وقت بحث کرنے کی ضرورت ہے؟''

''ضرورت تو نہیں'' میں نے مسکرا کر جواب دیا اور اپنے لیے ایک جوتا پسند کرنے لگی تھی۔

اندر سے خوفزدہ تھی کہ کہیں وہ لوگ اس دکان کے اندر بھی نہ آ جائیں مگر دکان میں خاص رش تھا۔ اور شاید اس ہجوم میں وہ نہ آتے مگر فوارے کے قریب تو بالکل بھی ہجوم نہیں تھا۔ وہاں پر پرس بھی چھین سکتے تھے۔ سونے کی چین بھی اتروا سکتے تھے۔ میں نے سونے

کی چین اتار کر اپنے پرس میں رکھ لی تھی۔

جوتوں کی خریداری کے بعد ایک بار پھر ریو کے اندرون شہر میں گھوم پھر رہے تھے۔لیذا کی ماں کیتھرین نے بڑی چاہت سے بلایا ہوا تھا۔لیذا کے لیے کوئی تحفہ بھی تو خریدنا تھا۔ریاض نے مشورہ دیا تھا کہ پھول یا کیک دونوں میں سے کوئی چیز لے جائیں گے۔ میں کچھ مطمئن ہوگئی تھی دوسرے دن برٹش ایمبیسی بھی تو جانا تھا وہاں جا کر پتہ لگانا تھا کہ ویزہ لگا ہے کہ نہیں۔ورنہ اپنے پاسپورٹ اور ٹکٹیں تو حاصل کرنی تھیں ان کے بغیر اپنے ملک میں واپسی ناممکن تھی۔

فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے آج بھی مجھے اس باجے والے فقیر کی دھن سننے کو جی چاہ رہا تھا۔

دور سے اس کی دھن سنائی دے رہی تھی۔میرے قدم تیز تیز چلنے لگے تھے تو ریاض نے مجھ سے کہا۔

''وہاں کھڑے نہیں ہونا۔''

''کیوں؟''

''بس کہہ دیا نا.......یہ لوگ بھی جرائم پیشہ لگتے ہیں۔''

ہمارے قدم ساحل سمندر کی طرف مڑ گئے تھے۔وہاں پر ریڑھیوں پر جانے کا اشتیاق ہو رہا تھا۔جو چیز ریڑھیوں پر دستیاب تھی وہی کسی بڑی دکان پر بہت مہنگی تھی۔اس لیے سوچا یہی تھا کہ یہاں کے سوینیئر لینے چاہئیں۔

آج بھی دھڑا دھڑ آوازیں لگا رہے تھے۔ایک برازیلین لڑکی ریڑھی پر کھڑی تھی۔اس کے بلانے پر میں اس کی ریڑھی پر چلی گئی تھی۔پتھروں کی بنی مختلف چیزوں میں کچھ پرندوں کی چیزیں اچھی لگی تھیں۔بہت سے طوطے چڑیاں جو پتھروں کی بنی ہوئی تھیں' جیولری اور جیولری رکھنے والا بکس بھی پتھروں ہی کا تھا اور بہت سی مختلف پرندوں کی چیزیں تھیں۔اب بارگیننگ کا مسئلہ تھا کہ اس کو کیسے کہا جائے کہ تم قیمت کم کرو۔

وہ کیلکولیٹر کے ذریعے قیمت بتانے لگی تھی اور میری سمجھ میں بات آ گئی تھی کہ اس کو کم کیسے بتایا جائے.......تو ہاتھوں کی انگلیوں سے گن کر بتایا کہ دس نہیں سات ریاز لگا لو۔کوئی چیز اتنی مہنگی کہ سو ریاز کے لگ بھگ تھی۔خیر کچھ اس کی بات مانی کچھ اس نے مجھ سے کم کیا۔بھاؤ ہو ہی گیا اور چند چیزیں میں نے لے لی تھیں۔ان چیزوں کے پیکٹ کو اٹھا کر ساحل سمندر پر ٹہلنے لگے تھے۔

آج سمندر پر بہت رونق تھی۔کچھ لوگ مچھلیوں کا شکار کرنے کے لیے کانٹے لگائے بیٹھے تھے۔کچھ خواتین بے نیازی تھیں' بکنیوں میں گھوم پھر رہی تھیں۔اسی طرح ان کی دھوتیاں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔یہ لباس صرف بیچ پر ہی نظر آتا تھا ورنہ اچھے لباسوں میں

بھی خواتین کو دیکھا تھا۔ جو کہ اتنی صحت یاب نہیں تھیں مگر اس کے باوجود دیکھنے میں انتہائی سمارٹ نظر آتی تھیں۔

ناریل کے درخت اور اناس کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں پر لوگوں کی بھیڑ تھی' سستا علاقہ تھا' ہر کوئی بیچ پر آنا پسند کرتا تھا۔

فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے فقیروں پر ایک بار پھر نظر پڑی تو میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ بے سدھ سے پڑے' بیٹھے اور سوئے ہوئے ملتے تھے۔ کسی نے دے دیا تو ٹھیک ہے ورنہ بھوکے ہی پڑے رہتے تھے۔ اتنے صابر قسم کے فقیر دیکھ دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ایک جگہ ایک فقیر جو نہایت ہی بوڑھا تھا تو میں نے آہستگی سے اپنے میاں سے کہا اسے کچھ ریاز دے دیں۔

ریاض نے اپنی جیب سے چند ریاز نکالے اور اس کی مٹھی میں تھما دیئے تھے۔ فقیر نے حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اپنی زبان میں شکریہ کرتے ہوئے ریاض سے ہاتھ ملایا تو میرا دل دہل گیا۔ "خدایا کیسے کیسے لوگ اس جہان میں آباد ہیں۔"

یہ سوچتے ہوئے ہم واپس ہوٹل پہنچ گئے تھے۔

لیزا کی منگنی

کیتھرین کے پرزور اصرار پر مجھے لیزا کی منگنی پر جانا پڑا تھا۔ کیتھرین نے میرے شوہر ریاض کو بھی خاص طور پر بلایا تھا۔

شام پانچ بجے کے بعد آنے کے لیے کہا گیا تھا۔ منگنی کی رسم باقاعدہ چرچ میں ادا ہو چکی تھی یہ ڈنر دولہا کے گھر والوں کے اعزاز میں دیا جا رہا تھا۔ ساحل سمندر کے کنارے سوپولو کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ ایک طرف سمندر تھا۔ آسمان کے سارے رنگ سمندر کی سطح پر تیر رہے تھے۔ لہریں اپنے جوبن پر تھیں۔ ہوا سرد اور تیز ہونے کی صورت میں ٹیکسی کے شیشے بند کر لیے تھے۔ مگر نظارہ کرنے میں کیا قباحت تھی۔

دور سے پہاڑی پر روشنیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ریو کے منظر کو دیکھنے کے لیے پہاڑی سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ اوپر سے روشنی کا عکس جب سمندر پر پڑتا ہے تو عجب ہی سماں پیدا کرتا ہے۔ روشنیاں قریب آنی شروع ہو گئی تھیں۔

خوبصورت روشنیوں سے پرنور گھر میں داخل ہوئے تو ان کے مہمان پہلے سے ہی آ چکے تھے۔

ہیرے جواہرات اور خوبصورت دیدہ زیب لباسوں میں ملبوس گھر کی چھت جو کہ ایک خوبصورت لان کی صورت میں تھا وہاں پر مہمانوں کی تواضع کی جا رہی تھی' چاروں طرف پھولوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں میز پر تحفے رکھے ہوئے تھے اور پھولوں کے گلدستے تو درجنوں کے حساب سے تھے۔ مرد لوگ بھی زبردست سوٹ اور ٹائیاں لگائے ہوئے تھے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہو

رہا تھا کہ ریو کے شہر میں یہ فنکشن ہو رہا ہے۔ جو کوئی بھی آتا وہ اپنا کتا اپنے ہمراہ ضرور لاتا۔ کتے ملازم ایک طرف لے گئے تھے۔ ان کی علیحدہ پکنک پارٹی ہو رہی تھی جہاں پر کتے' کتیاں اور ان کے بچے شامل تھے۔

رنگا رنگ پھولوں کی کیاریوں کے پاس کھانے کی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ سب لوگ لان میں کھڑے تھے۔ لان کے کناروں پر صوفے لگے ہوئے تھے جس کسی کا جی چاہتا وہ صوفے پر جا کر بیٹھ جاتا۔ ہر قسم کا مشروب چل رہا تھا۔ ہار سنگھار کئے تر و تازہ خواتین سلم سمارٹ اتنی اچھی لگ رہی تھیں۔ میرا دھیان ریو کی ان عورتوں کی طرف چلا گیا جو بکنی اور دھوتیاں پہنے بے نیاز سی تھیں۔ جو شکل سے اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی اگر لیڈا کے گھر نہ آتی تو میں یہی تاثر لے کر واپس جاتی کہ ریو میں بسنے والے بہت غریب ہیں۔ مگر لیڈا کے گھر جو لوگ آئے ہوئے تھے' یوں معلوم پڑتا تھا کہ سارا شہر امیر ترین لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔

ہم نے ساحل سمندر کے سامنے والے صوفوں پر بیٹھنا پسند کیا تھا یہاں پر بیٹھ کر تمام لوگوں کا جائزہ بھی لے جا سکتی تھی اور سمندر کا نظارہ بھی۔ اس دن شام کو ریو اتنا خوبصورت دکھائی نہیں دیا تھا جتنا کہ رات کے وقت سارے شہر کی بتیاں روشن دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کا گھر پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔

خوش پوشاک خواتین آپس میں باتوں میں محو تھیں۔ مارگریٹ آج بہت ہی خوش تھی۔ ہوتی بھی کیوں نہ آج اس کی پیاری سہیلی کی بیٹی کی منگنی کا ڈنر ہو رہا تھا۔ ہر کوئی خاتون میرے لباس کو بہت سراہ رہی تھی۔ کوئی سکرٹ پہنے ہوئے تھی اور کوئی لمبی سکرٹ جو پاؤں تک لمبی تھی۔ کامدار بلاؤز سٹرن کمپنی اور ایم ایمسٹرڈیم کی جیولری پہنے ہوئے تھیں۔ مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ دو کمپنیاں انہی ہی خواتین کے دم سے آباد ہیں۔

بقول ایک خاتون کے جو میرے قریب ہی آ کر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے اس کا لباس اور زیورات بہت پسند آئے تھے۔

''آپ کا لباس بہت عمدہ ہے۔''

''مجھے تو آپ کا لباس بہت پسند آیا ہے۔ میرا جی کرتا ہے کہ ایسا لباس میں بھی بنواؤں۔''

''مگر یہاں پر پاکستانی رہتے ہی نہیں ہیں' اگر رہتا بھی ہوں تو ان کو سینا کہاں آتا ہوگا۔''

''تو کیا کوئی پاکستانی آپ کا یہاں واقف نہیں ہے؟''

''ہوں گے تو ضرور' مگر میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ زیادہ تر پاکستانی امریکہ میں آباد ہیں۔ یہاں میں نے ان کو کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔ مجھے تو جیولری اور اچھے کپڑوں کا بہت ہی شوق ہے۔''

"وہ تو اندازہ ہو ہی رہا ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

میوزک کی ہلکی ہلکی دھن بجنی شروع ہو گئی تھی۔ تمام جوڑے کھڑے ہو کر ڈانس کرنے لگے تھے۔ ان میں لیڈا بھی اپنے منگیتر کے ساتھ ڈانس کرنے لگی تھی اور کیتھرین اپنے شوہر کے ساتھ ڈانس میں مصروف ہو گئی تھی۔

آسمان پر چاند اور ستارے اونچائی ہونے کی نسبت بہت روشن دکھائی دے رہے تھے۔ پورا چاند روشن تھا۔ شاید چاند کی چودھویں تاریخ تھی۔ نیچے نظر پڑی تو چاند اور ستاروں کا عکس جل میں آگ لگا رہا تھا۔ اتنا خوبصورت سماں دیکھ کر میں سوچ رہی تھی ۔۔۔۔۔۔ یہاں کی دنیا اور غریبوں کی دنیا میں کتنا فرق تھا۔ جہاں پر ضیافتیں ہو رہی تھیں اور کہیں بھوک سے نڈھال لوگ کسمپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔

وہ خاتون جو میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی وہ ڈانس کرنے کے لیے اٹھ گئی تھی وہ اکیلی آئی تھی اور کوئی پارٹنر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ ہر کوئی مصروف تھا۔

چاند روشن تھا۔ ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ آج اس ضیافت میں ہم موجود تھے نہ جانے کتنے لوگ یہاں آئے ہوں گے۔ اور ایسی ضیافتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔ موسیقی کی دھن اب تیز ہو چکی تھی۔ مشروب پینے والے ابھی بھی مصروف تھے۔

ہر جگہ امراء کے ڈھنگ ہی نرالے ہوتے ہیں۔ لیڈا اور کیتھرین کی پرزور دعوت سے میں یہاں کی ضیافت دیکھنے کے لیے آ گئی تھی ورنہ اس وقت ہم نے ہوٹل میں بیٹھے ہونا تھا۔

وہاں پر بیٹھے بیٹھے میں لان کی نچلی منزل کے حصے میں جو لان تھا وہاں پر دیکھنے لگی تھی۔ جس لان سے دیکھ رہی تھی شاید اس گھر کی چوٹی میں بنا ہوا تھا۔ کئی منزلیں تھیں۔ نیچے کی منزل کا جو لان تھا وہ اس پر بھی ایک دعوت چل رہی تھی۔ میں اس قدر حیران ہوئی کہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ایک میز پر کھانا چنا ہوا تھا۔ دوسرے میز پر جوس پڑے ہوئے تھے۔

پانچ یا چھ ملازم دس پندرہ کتوں اور کتیوں کو لیے کھڑے تھے۔ صاف ستھرے برتنوں میں کھانا میز سے اٹھا اٹھا کر ان کے سامنے رکھ رہے تھے۔ مجال ہے کہ کھانا دیکھ کر کوئی ہڑبونگ مچی ہو۔ صبر و تحمل سے ہر کوئی کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ ملازم لوگ بھی خاصے ایفی شنٹ دکھائی دے رہے تھے۔ اور اوپری دعوت کو تو میں بھول ہی گئی تھی۔

اس قسم کی دعوتیں تو عام دیکھنے میں آتی تھیں مگر یہ دعوت میرے لیے نئی اور نرالی تھی۔

اس قدر نظم وضبط کا مظاہرہ دیکھ کر خیال ہو رہا تھا کہ یہاں پر کتے ڈسپلن سیکھ جاتے ہیں اور ایک ہم ہیں جو دوسرے ملکوں سے بہت ہی پیچھے ہیں۔

خوش قسمت کتے

میرے قریب بیٹھنے والی خاتون شاید ڈانس کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ وہ پھر میرے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی تو میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔

"یہ کتے آپ لوگوں کے ہمراہ آئے ہیں؟"

"جی"

وہ مسکرا پڑی تھی۔ ان کو کھاتا ہوا دیکھ کر کہنے لگی۔

"وہ سفید کتی میری ہے۔"

"اچھا۔۔۔۔۔۔۔۔بہت خوبصورت ہے۔"

"بڑے پیار سے میں نے اسے رکھا ہوا ہے۔ بہت توجہ دینی پڑتی ہے۔"

"آپ کے بچے نہیں ہیں کیا؟"

"بچے!"

وہ ہنس پڑی۔

"اسی کو پالنے میں اتنا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اگر بچے پیدا کر لیے تو اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

"تو کیا اس کے لیے آپ نے۔۔۔۔۔۔"

"شادی ہی نہیں کی ہے۔"

اچھا"

"ہاں بھئی شادی کروں' پھر بچے پیدا کرنے ضروری ہیں۔ بہت جھنجھٹ کا مسئلہ ہے۔ والدین پراپرٹی چھوڑ گئے ہیں۔ روزگار کا مسئلہ نہیں ہے۔ پھر شادی کا فائدہ کیا۔۔۔۔۔۔۔شادی اسی لیے تو کرتے ہیں' پیسے کی ضرورت کے لیے۔"

اس خاتون کی باتیں سن کر اور بھی حیرانگی ہو رہی تھی کہ کتی کی خاطر وہ شادی نہیں کر رہی تھی۔

"بچے۔۔۔۔۔۔۔بڑھاپے میں کام آتے ہیں۔"

"ہمارے"

وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔

"ارے وہ بہت آزاد ہو جاتے ہیں۔ اکثر بوڑھوں کو روتا ہوا دیکھتی ہوں تو ان پر ترس آتا ہے۔ جن کے بچے ان کو چھوڑ دیتے ہیں اور آ کر خبر گیری بھی نہیں کرتے ہیں۔"

"کبھی کبھار تو آتے ہی ہوں گے۔"

"کوئی تو آ جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔اور کوئی پوچھتے ہی نہیں ہیں۔"

"آپ کے والدین کہاں ہیں؟"

"وہ برازیل میں ہی تھے' ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں تعلیم کے سلسلے میں دوسرے ملک میں رہتی تھی اور تعلیم کے بعد بھی بہت کم برازیل آتی تھی میں نے اپنے والدین کو وقت ہی نہیں دیا تھا جس کا کبھی کبھی مجھے افسوس بھی ہوتا ہے۔ میں سمجھے ہوئے تھی جیسے سدا انہوں نے جیتے ہی رہنا ہے۔"

"وفات کے بعد آپ یہاں آ گئی ہیں؟"

"ہاں' میں برابر کے گھر میں رہتی ہوں۔ اپنی پراپرٹی کی خاطر آنا ہی پڑا تھا۔"

کتنے کٹھور ہوتے ہیں یہ لوگ' والدین کی خاطر نہیں آئی بلکہ پراپرٹی کی خاطر یہاں چلی آئی ہے۔

ہم لوگ بے شک ان سے پیچھے ہیں مگر محبت اور خلوص کے معاملے میں بہت اونچے ہیں۔ ہم اپنے بوڑھوں کو اولڈ ہاؤس میں نہیں بھیجتے۔ بے شک ان سے تنگ بھی آ جائیں مگر انہیں اپنے کلیجے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے میں دعوت میں آئے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگی تھی۔

الوداع برازیل

آج پاکستان جانے کے لیے پیکنگ کر رہی تھی۔ ہوٹل میں آخری دن تھا۔ ناشتہ کرنے کے لیے ہوٹل کے ریستوران پر چلے گئے تھے۔ وہ لڑکی آج بڑی مغموم دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔

''تم اداس کیوں ہو؟''

''آپ جا رہی ہیں اس لیے اداس ہوں۔''

''اچھا' تم میرے جانے سے اداس ہو؟''

''ہاں''

میں نے ناشتہ کرنے کے بعد اس کے ساتھ ایک تصویر بنوائی اور کہا کہ میں تمہاری تصویر کو پاکستان لے کر جاؤں گی تا کہ کبھی کبھی ریو کی تصویریں دیکھوں تو تم یاد آؤ۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ وہ پرتگالی بولتی جاتی تھی اور ریستوران کے باہر بیٹھنے والا لڑکا انگریزی میں مجھے بتاتا جاتا تھا۔ میں نے اس کو ٹپ دی اور لفٹ کے ذریعے نیچے آ گئی تھی۔ لابی میں ریاض پہلے سے ہی موجود تھے۔ شاید ٹیکسی کا بندوبست کروا رہے تھے۔ دربان لڑکا اسی طرح باہر کھڑا تھا۔ ایک ٹیکسی کو روک کر ہمیں اندر بلانے آ گیا تھا۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ہم نے برٹش ایمبیسی کی طرف جانے کے لیے کہا تو وہ اپنے سر کو ہلاتے ہوئے مجھے بتانے لگا کہ

''میں جانتا ہوں آپ کو لے جاؤں گا۔''

ریو میں ایک حسرت بھی رہی تھی' کسی بھی پرتگالی سے کھل کر بات نہیں کر سکے تھے۔ وہاں پہنچ کر تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا تھا ۔۔۔۔۔۔ اور پاسپورٹ ہمارے حوالے کئے گئے تھے جس پر لندن کا ویزہ لگا ہوا تھا۔ ویزے کا سن کر انتہائی خوشی ہوئی چلو چند روز لندن میں اپنے دوست واحباب کو مل لیں گے۔

اس وقت صبح کے دس بجے ہوئے تھے۔ سوچا کہ کیوں نا ایک آدھ جوتا لیا جائے۔ کوپا کبانہ کے بیچ میں بہت اچھا بازار تھا جہاں پر بہت اچھے جوتے دستیاب تھے۔

دوپہر کے وقت خریداری کرتے ہوئے ایک پیزہ ہٹ کی طرف چلے گئے تھے۔ مگر وہاں پر بیف چکن اور نہ جانے کون کون سے گوشت کا بنا پیزہ تھا۔ ہم نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمیں سبزیوں کا پیزہ چاہیے۔ وہ ویٹر میرا منہ دیکھنے لگ گیا تھا۔ ابھی میں مزید کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ایک دم دکان سے منسلک دکان پر نظر پڑی تو وہ سبزی کی دکان تھی۔ میں نے ویٹر کو سبزیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ پیزہ اس کا بنا کر دو۔ تو وہ مسکرا کر چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی زبان میں انتظار کرنے کے لیے کہنے لگا تھا۔

ہم نے سمجھا کہ ان کے پاس سبزیوں کا پیزہ نہیں ہے شاید۔

جونہی اٹھنے لگے تو اس نے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا تھا۔اس کا مطلب تھا کہ ہم انتظار کریں۔

آدھا گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ سبزیوں والا پیزہ وہ لے آیا تھا۔مگر آدھا پیزہ سبزیوں کا تھا اور آدھا بیف کا بنا کر لے آیا تھا۔اب اس کو کہتے تو کیا کہتے۔آدھا بیف والا اس کو واپس کر دیا تھا اور سبزیوں والا زہر مار کر کے ہم لوگوں نے کھا لیا تھا۔

رات دس بجے ہماری فلائیٹ کا وقت تھا۔میں نے اپنے میاں سے کہا کہ چھ بجے ہم ائیر پورٹ چلے جائیں گے۔

وہ جواب دیتے ہوئے کہنے لگے۔

"اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت ہے۔سات بجے کے بعد ائیر پورٹ جائیں گے۔میں خاموش ہو گئی تھی۔کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ ایک بار پھر بازار کی سمت مڑ گئے تھے۔کئی سٹور اور دکانیں فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ نظروں سے گزر رہی تھیں۔دکانوں میں کسی قسم کا ہجوم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے تمام ریو میں بسنے والے بڑے آرام سے شاپنگ کرتے ہیں۔کوئی رش ہی نہیں تھا حالانکہ شہر کا بہترین علاقہ تھا۔شاید لوگ فضول خرچی نہیں کرتے تھے۔ہو سکتا ہے غربت زیادہ ہونے کی وجہ سے خریداری کم تھی۔

آخری چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ہم دکانوں میں گھوم پھر کر اپنا وقت پاس کر رہے تھے۔

جلد ہی شام ہو گئی تھی۔قدم خود بخود ساحل سمندر کی طرف اٹھنے لگے تھے۔ساحل پر بچے فٹ بال کھیل رہے تھے۔کئی جوان جوڑے گھروندے بنا رہے تھے۔جب سمندر کی لہر آتی تو ریت کا گھروندا بہا کر اپنے ہمراہ لے جاتی تھی۔وہ ہمت نہیں ہارتے تھے۔لہروں کے جاتے ہی وہ پھر سے گھروندے بنانے شروع کر دیتے تھے۔آج بھی ویک اینڈ تھا۔لڑکے اور لڑکیاں بیچ پر آئے ہوئے تھے۔کچھ جوڑے دنیا و مافیہا سے لاتعلق اپنی اپنی دھن میں مست تھے۔

ساحل پر پہنچ کر خیال آیا تبھی بازاروں میں رش نہیں ہے تمام ریو ادھر سمٹ کر آ گیا ہے۔

لہروں کا آنا اور گھروندوں کو بہا کر لے جانا' پھر سے گھروندوں کا بننا.......یہ عمل کافی دیر تک جاری رہا تھا۔ادھر سے ہٹ کر دوسری سمت آئے تو بیچ پر دو بوڑھے جوڑے بیٹھے تھے۔وہ ساکن سے بیٹھے اٹھتی موجوں کا نظارہ لے رہے تھے۔موجوں میں طغیانی تھی مگر ان میں جمود طاری تھا۔

کچھ لڑکے ناریل کا جوس پی رہے تھے۔کئی لوگ نمک مرچ لگا کر بھٹے کھا رہے تھے۔شاید رات کا کھانا ہی بھٹے تھے۔سمندر کو آخری بار اپنی آنکھوں میں سمونے کی کوشش کی تھی۔اس وقت شفق کے رنگ سمندر پر اترنے شروع ہو گئے تھے۔برازیل کی شام

رنگین سے رنگین تر ہو رہی تھی۔ سرد ہوا کا جھونکا دل کو تقویت دے رہا تھا اور اس وقت خیال پیدا ہو رہا تھا کہ ایک گھنٹے کے بعد واپس بھی جانا ہے۔ اور پھر شاید اس سرزمین پر واپس بھی آ سکیں گے کہ نہیں۔ سمندر کی لہروں' وہاں کی فضا اور وہاں کے پہاڑوں کو خدا حافظ کہا اور ہوٹل سے سامان لے کر سیدھے ائیر پورٹ پہنچ گئے تھے۔ ائیر پورٹ پر اس قدر ہجوم تھا کہ کھوے کے ساتھ کھوا چل رہا تھا۔

جب لف تیزہ کے کاؤنٹر پر جا کر ٹکٹ دکھائے تو اس خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ جہاز تو ساڑھے سات بجے چلے جانا تھا اور میرے خیال سے اڑ چکا ہو گا۔"

اس کی اس بات سے حیرانگی پیدا ہوئی۔ ٹکٹوں کو کھول کر دیکھا ہی نہیں تھا۔ پاکستان سے جو پروگرام لے کر آئے تھے اسی کے مطابق رات کے دس بجے فلائیٹ جاتی تھی مگر جہاز اڑ چکا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنے میاں پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی کو کہا۔

"اب تو ہوٹل بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"فلائیٹ کل رات دس بجے جائے گی۔ آج فلائیٹ ساڑھے سات گئی ہے۔ کل آ جائیں وقت سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے۔"

"لیکن پلیز آج۔۔۔۔۔۔"

"آج کیا کوئی اسپیشل جہاز بک کروائیں تمہارے لیے؟" ریاض نے خفگی سے کہا۔

ابھی ہم دونوں میں تکرار ہو رہی تھی کہ اس خاتون کو رحم سا آ گیا تھا' وہ کہنے لگی۔

"ہم کسی اور جہاز میں لندن تک بھیج دیتے ہیں۔ مگر کاؤنٹر پر جا کر دیکھ لیں' کوئی سیٹ خالی ہو تو۔۔۔۔۔۔"

"اگر سیٹیں خالی نہ ہوئیں تو۔۔۔۔۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"تو آپ کی قسمت" یہ کہتے ہوئے وہ دوسرے مسافروں میں مصروف ہو گئی تھی۔

اس وقت جی کرنے لگا کہ پر لگ جائیں اور اڑ کر سیدھا لاہور پہنچ جائیں۔ باہر کے ملک خوشی خوشی چلے تو جاتے ہیں مگر قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کاؤنٹر پر گئے جہاں پر پہنچنے کے لیے اس نے کہا تھا۔ شاید خدا نے میری سن لی تھی اور ہمیں دو سیٹیں مل گئی تھیں اور اس طرح سے ریوے لندن تک بڑے آرام سے سفر کٹ گیا تھا۔

جونہی لندن پہنچے تو سامان وصول کرنے کے بعد اپنے دوست و احباب کو ائیر پورٹ سے فون کرنے کی کوشش کی تھی۔ تمام ڈائریاں جن پر ان کے ایڈریس اور فون نمبر لکھے تھے ریو پر ہی بھول آئے تھے۔ ایکسچینج پر پتہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کے پتے

اور فون نمبر بدل چکے تھے۔ لہٰذا ایک نئی دشواری آن کھڑی ہوگئی تھی۔

مگر ایک بات کی خوشی بھی ہو رہی تھی کہ یہاں پر زبان کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بہت تھکے ہوئے تھے تو ائیر پورٹ ہیتھرو کے ایک ریستوران میں بمعہ سامان کے بیٹھ کر چائے پینے کے لیے چند سیڑھیاں چڑھ کر جب اوپر آئے تو انگریزی میں کچھ بتانے ہی والے تھے کہ اس لڑکے نے اردو میں پوچھا "آپ چائے پئیں گے کہ کافی؟" میں حیرانگی سے اس کی جانب دیکھنے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کسی بھوکے کو کھانا میسر آ گیا ہو۔

"تو کیا آپ۔۔۔۔۔۔۔؟"

"میں پاکستانی ہوں۔" اس نے اردو میں بتایا۔

"اچھا!"

میں ایک میز کی طرف جاتے ہوئے دو چائے کا آرڈر دینے لگی اور اس سے پوچھ بیٹھی۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"میں فیصل آباد سے آیا ہوں۔" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک سکھ اس کے پاس کاؤنٹر پر آتے ہوئے بولا۔

"او یار! اک کڑک چاہ بنا۔"

"اچھا سردار جی!"

وہ اس کے لیے چائے بنانے لگا۔ چائے پینے کے بعد ہمیں فکر لگی ہوئی تھی کہ کہاں جایا جائے۔ ہیتھرو ائیر پورٹ میں انکوائری کے کاؤنٹر پر کھڑے عملے سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے ہیتھرو سے منسلک ہوٹل میں ٹھہرانے کے لیے پچاس پاؤنڈ کا مطالبہ کیا' جو ہم نے ادا کر دیا۔ سامان لے کر باہر پہنچے تو اس قدر ٹھنڈ تھی کہ ایک منٹ بھی کھڑا ہونا دشوار تھا۔ مگر انکوائری کے عملے نے یہ بھی کہا تھا کہ ہوٹل تک پہنچانے کا بندوبست بھی ہمارا ہے۔ ہر دس منٹ کے بعد گیٹ نمبر دس پر بس آتی ہے جو ہوٹل میں پہنچا دیتی ہے۔ ابھی پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے ایک بس گیٹ نمبر دس پر آ کر رک گئی۔ اس میں ڈرائیور ایک سکھ بیٹھا ہوا تھا وہ بس سے نیچے اترا' ہمارا سامان بس کے اندر رکھا اور ہوٹل لے جاتے ہوئے راستے میں پوچھنے لگا۔

"تسی کتھوں آئے ہو جی؟"

"لاہور سے۔"

''اولاہور دیکھن نوں بڑا جی کردا اے۔ پارٹیشن توں پہلاں ساڈے وڈے اوتھے ریندے سی۔''

کہاں ریو میں زبان کا مسئلہ تھا اور کہاں لندن جیسے مقام میں اردو تو ایک طرف سکھ پنجابی میں بات چیت کر رہے تھے جو دل کو اچھی لگ رہی تھی۔ ہوٹل جب آیا تو وہ ریسیپشن تک ہمارا سامان اٹھا کر اندر لایا تھا تو میں بے حد متاثر ہوئی تھی۔

پارک ہوٹل درمیانے درجے کا صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ بس کی سروس اچھی تھی جو برٹش ریل اسٹیشن تک اتار کر واپس ہوٹل آ جاتی تھی۔ سارے دن کی دو ٹکٹیں لے کر دن بھر لندن کی سڑکوں کی خاک چھانتے رہے تھے' کئی سٹورز دیکھے۔ میوزیم اور سیر گاہوں پر جا نہ سکے تھے۔ کیونکہ کئی مرتبہ آ چکے تھے اور ہر مرتبہ عجائب گھروں کو نئے سرے سے دیکھتے رہے تھے۔ اب کی مرتبہ نہ صرف چیزوں میں بلکہ کھانے پینے میں لندن بہت مہنگا لگا تھا۔

صرف تین روز رہنے کے بعد اپنی پاک سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہے تھے کہ اتنے لمبے سفر سے اس نے نجات دلائی۔

